سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

مختصر سیرت خیر البشر

مولانا محمد عبد الہادی القادری بدایونی



شکریہ

ہم عزت مآب محترم علامہ اسید الحق عاصم قادری دامت برکاتہم العالیہ کے نہایت ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب انٹرنیٹ پر پبلش کرنے کے لئے ہمیں عنایت فرمائی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے اس تعاون پر ان کو اجر کثیر عطا فرمائے اور قبلہ علامہ صاحب کے فیوضات و برکات و درجات میں مزید اضافہ فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الامین ﷺ

نفس اسلام ویب ٹیم

www.nafseislam.com

مختصر سیرت خیرالبشر



مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی

انتساب

مصنف کے استاذ

مفتی اکرام احمد لطفؔ قادری بدایونی

کے نام

جنھوں نے صرف دو مصرعوں میں مکمل سیرت طیبہ بیان کردی

رخ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ کسی کی بزم خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

اسید الحق قادری

جشن زریں

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے　　　یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

مارچ ۲۰۱۰ء میں تاجدار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری (زیب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف) کے عہد سجادگی کو پچاس سال مکمل ہونے جارہے ہیں، ان پچاس برسوں میں اپنے اکابر کے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے رشد وہدایت، اصلاح وارشاد، وابستگان کی دینی اور روحانی تربیت اور سلسلۂ قادریہ کے فروغ کے لیے آپ کی جدوجہد اور خدمات محتاج بیان نہیں، آپ کے عہد سجادگی میں خانقاہ قادریہ نے تبلیغی، اشاعتی اور تعمیری میدانوں میں نمایاں ترقی کی، مدرسہ قادریہ کی نشاۃ ثانیہ، کتب خانہ قادریہ کی جدید کاری، مدرسہ قادریہ اور خانقاہ قادریہ میں جدید عمارتوں کی تعمیر، یہ سب ایسی نمایاں خدمات ہیں جو خانقاہ قادریہ کی تاریخ کا ایک روشن اور تابناک باب ہیں۔

بعض وابستگان سلسلہ قادریہ نے خواہش ظاہر کی کہ اس موقع پر نہایت تزک واحتشام سے ''پچاس سالہ جشن'' منایا جائے، لیکن صاحبزادۂ گرامی قدر مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری (ولی عہد خانقاہ قادریہ بدایوں) نے فرمایا کہ ''اس جشن کو ہم 'جشن اشاعت' کے طور پر منائیں گے۔ اس موقع پر اکابر خانوادۂ قادریہ اور علماء مدرسہ قادریہ کی پچاس کتابیں جدید آب وتاب اور موجودہ تحقیقی واشاعتی معیار کے مطابق شائع کی جائیں گی، تاکہ یہ 'پچاس سالہ جشن' یادگار بن جائے اور آستانہ قادریہ کی اشاعتی خدمات کی تاریخ میں یہ جشن ایک سنگ میل ثابت ہو''۔ لہٰذا حضور صاحب سجادہ کی اجازت وسرپرستی اور صاحبزادۂ گرامی کی نگرانی میں تاریخ ساز اشاعتی منصوبہ ترتیب دیا گیا اور اللہ کے بھروسے پر کام کا آغاز کر دیا گیا، اس اشاعتی منصوبے کے تحت گزشتہ ۲ سال سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

رب قدیر ومقتدر سے دعا ہے کہ حضرت صاحب سجادہ (آستانہ قادریہ بدایوں) کی عمر میں برکتیں عطا فرمائے، آپ کا سایہ ہم وابستگان کے سر پر تا دیر قائم رکھے۔ تاج الفحول اکیڈمی کے اس اشاعتی منصوبے کو بحسن وخوبی پایہ تکمیل کو پہنچائے اور ہمیں خدمت دین کا مزید حوصلہ اور توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

عبدالقیوم قادری
جنرل سکریٹری تاج الفحول اکیڈمی
خادم خانقاہ قادریہ بدایوں شریف

فہرست مشمولات




Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

حرفِ آغاز

تاج الفحول اکیڈمی اپنے اشاعتی منصوبے کے چوتھے مرحلے میں خانوادۂ قادریہ بدایوں کے فرزند حضرت مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی کی کتاب احوال ومقامات اہل ذوق کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کر رہی ہے۔

مصنف کتاب مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی حضرت عاشق الرسول مولانا محمد عبدالقدیر قادری بدایونی کے صاحبزادے، حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر قادری بدایونی کے پوتے اور حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری زیب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں کے برادر اکبر تھے۔

آپ کی ولادت ۱۳؍رجب المرجب ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء کو بدایوں میں ہوئی، تعلیمی مراحل اپنے آبائی مدرسے مدرسہ قادریہ میں طے کیے۔ اساتذہ میں والد ماجد کے علاوہ حضرت مفتی حبیب الرحمن قادری بدایونی اور حضرت مولانا عزیز احمد قادری بدایونی کے نام قابل ذکر ہیں، بچپن میں سرکار صاحب الاقتدار شاہ عبدالمقتدر قادری بدایونی قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور والد ماجد کے وصال کے بعد ان کے جانشین اور اپنے چھوٹے بھائی حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری زیب سجادۂ خانقاہ قادریہ کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی، مدرسہ قادریہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور نظام کالج حیدرآباد سمیت مختلف اداروں میں ادبِ عربی کے استاذ رہے، ۱۹۷۸ء میں نظام کالج حیدرآباد کے شعبۂ عربی سے استاذ ادبیات عربی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ جید اور وسیع المطالعہ عالم دین ہونے کے علاوہ عربی ادب ان کا خاص میدان تھا، عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔

دولت فقر اور مشرب تصوف وسلوک خاندانی ورثہ کے طور پر پایا تھا، ان کی اپنی قلندرانہ شان،

طبیعت کے سوز و گداز اور عشق و مستی کی واردات نے ان کے سلوک کو مزید جلا بخشی تھی، اسی کا اثر تھا کہ ہر قسم کا آرام اور آسائش ترک کر کے زندگی کے آخری سات آٹھ سال شہر سے باہر ویرانے میں حضرت بابا بہاء الدین انصاری قدس سرہٗ کی درگاہ (دولت آباد ضلع اورنگ آباد مہاراشٹر) کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں چٹائی پر گزار دیئے۔

کہتے ہیں کہ مٹی کی کشش آدمی کو کھینچ لاتی ہے، ان کو بھی بدایوں کی مٹی نے اپنی طرف کھینچا، اور وفات سے چند ماہ قبل حضرت صاحب سجادہ اصرار کر کے ان کو بدایوں لے آئے، یہیں ۱۱ر محرم الحرام ۱۴۱۵ھ/ ۲۲ر جون ۱۹۹۴ء کو انتقال فرمایا اور درگاہ قادری میں آسودۂ خاک ہوئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

نظام کالج کی ملازمت کے زمانے میں ایک میگزین الاشعۃ کا اجرا کیا، یہ بیک وقت عربی اور اُردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا، اس میں ان کی اُردو نگارشات ان کے اصلی نام سے اور عربی نظم و نثر ''صاحب القلم الاحمر'' اور ''الاستاذ الاموی'' کے قلمی نام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔

نعت و مناقب کے دو مجموعے نغمۂ قدسی اساس اور خرابات اور بہاریہ شاعری کا ایک مجموعہ خمیازۂ حیات شائع ہو چکے ہیں۔

اُردو، عربی، فارسی میں آپ کی شعری اور نثری کاوشوں کا ایک مجموعہ راقم سطور نے ''باقیات ہادی'' کے نام سے ترتیب دیا ہے جو طباعت کے مرحلے میں ہے۔

زیر نظر رسالہ کا مسودہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کی صاحبزادی بیگم سید اکرام احمد رزاقی (اورنگ آباد) کے پاس محفوظ تھا، اس پر رسالہ کا کوئی نام درج نہیں تھا، کتاب کے موضوع اور اسلوب اختصار کو دیکھتے ہوئے اس کا نام ''مختصر سیرت خیر البشر'' زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ رسالہ اپنے اختصار و ایجاز کے باوجود شانِ جامعیت رکھتا ہے۔ اختصار کے پیش نظر بہت سے اہم واقعات مصنف نے نظر انداز کر دیئے مثلاً معجزۂ معراج وغیرہ لیکن اس ایجاز و اختصار کے باوجود ان کے وسیع اور گہرے تاریخی مطالعے، علمی استناد اور باوقار اور شگفتہ اسلوب نے رسالہ کو وقیع بنا دیا ہے، رسالہ کی ابتدا میں بطور تمہید و مقدمہ دورِ جاہلیت، ایام عرب اور بعثت سے قبل عرب کے

حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں خلافت راشدہ، دولت اموی اور حادثہ کربلا تک گفتگو کا سلسلہ دراز کرنے سے رسالہ کی علمی اور تاریخی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

تاج الفحول اکیڈمی پہلی بار اس رسالہ کو منظر عام پر لا رہی ہے، رب قدیر و مقتدر سے دعا ہے کہ اس کو مقبول و نافع بنائے، مصنف، ناشر اور تمام معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے، (آمین)

اسید الحق قادری
مدرسہ قادریہ بدایوں

۲۰/ ذوالحجۃ ۱۴۳۰ھ
۸/ دسمبر ۲۰۰۹ء



☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملک عرب کی آبادی

جزیرہ نمائے عرب کی قدیم تاریخ کے بارے میں معلومات نہ ہونے کی برابر ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے خصوصی طبعی حالات کی بنا پر اس حصہ سے دوسروں نے دلچسپی ہی نہ لی اور خود عرب کے رہنے والے اپنے حال میں ایسے مگن تھے کہ انھیں بھی بیرونی دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

غیر معمولی سخت طبعی حالات کے باوجود عرب میں قدیم ترین زمانہ سے آبادی رہی ہے جس کے ثبوت میں ایک دلچسپ بات تو یہ کہی جاسکتی ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے مرد وعورت (آدم وحوا) کا ملن میدان عرفات میں ہی ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ہی آدم کی اولاد کا سلسلہ شروع ہوا ہوگا، اس طرح دنیا میں سب سے پہلے جہاں آبادی کا امکان ہے وہ خطہ جزیرہ نمائے عرب ہی ہوسکتا ہے۔ ملاقات کے میدان کا نام ''عرفات'' اور مدفن بننے والے شہر کا نام ''جدّہ'' (وادی) آج بھی ہمیں اسی طرف اشارہ کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

اثریات کے ماہرین کو حالیہ کھدائیوں میں جو سامان حاصل ہوا ہے اس سے بھی وہ اسی نتیجہ پر

پہنچے ہیں کہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا مرکز کبھی یہ خطہ رہ چکا ہے جو آج جزیرہ نمائے عرب میں شامل ہے۔ارض ''بابل'' اور ''نینوا'' دونوں قدیم ترین تہذیبی مراکز سمجھے جاتے ہیں۔

میرے خیال میں عرب کی قدامت تمدن پر سب سے بہتر دلیل ان کا ادب ہے، ہمارے پاس جو جاہلی ادب پہنچا ہے وہ زیادہ قدیم نہیں، زیادہ سے زیادہ عہد اسلام سے ایک صدی پہلے تک کا ہوسکتا ہے کیونکہ کتابت سے بے نیازی تھی، قوت حافظہ کتنی ہی قوی سہی زندگی جاودانی نہیں، اس لیے بڑا حصہ بلکہ بے شمار ادبی شاہکار تو ضائع ہو گئے ہوں گے صرف تھوڑا سا جو بہت زیادہ مقبول تھا اور زیادہ قدیم تھا اس کی روایت عہد اسلام تک پہنچی اور اسے محفوظ کرلیا گیا۔

یہ ادبی سرمایہ جسے ہم جاہلی کہتے ہیں مختصر سہی مگر اتنا مکمل اور اعلیٰ ہے کہ کسی زبان کے ابتدائی دور میں ایسا اسلوب اور قوی قوت ادا کا امکان ہی نہیں، قرنوں میں تو کہیں جا کر زبان اپنی صورت پکڑتی ہے اور ادائے معانی کی قوت اور اسالیب بیان کا تنوع تو اس کے بھی بعد پیدا ہوتا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادب ایک قدیم ترقی یافتہ قوم کا ادب ہے۔

طبقات عرب

عرب میں بسنے والی قوموں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے

(۱) عرب بائدہ

(۲) عرب متعربہ (بنوقحطان)

(۳) عرب مستعربہ

پہلا طبقہ بائدہ یعنی ہلاک ہوجانے والا کہلاتا ہے، عرب کہانیاں بھی ان کے اذکار سے خالی ہیں اور ان کی یادگاریں بھی مٹ چکی ہیں، صرف چند نام معلوم ہیں: عاد، ثمود، طسم، جدیس۔

ان قوموں کی سرکشی، انھیں سیدھے راستہ پر لانے کی کوشش اور پھر انھیں ہلاک کرائے جانے کی تفصیلات ہمیں قرآن نے بتائی ہیں ورنہ ان کے متعلق ہم اتنا بھی نہ بتا سکتے۔

قوم عاد کو سب سے زیادہ شہرت حاصل تھی، ان کا قیام ارض احقاف میں تھا، سمجھا جاتا ہے کہ قوم عاد کی طرف نسبت کی بنا پر اس نام سے پکاری گئی۔ عاد اصل میں ارم ابن سام کے ایک پوتے کا نام تھا،

وہ سب سے پہلا بادشاہ تھا، یہ قوم اپنے وقت میں سب سے قوی تھی، قرآن نے بتایا ہے:

الم تر کیف فعل ربک بعادٍ ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلھا فی البلاد۔

کیا تمہیں معلوم نہیں تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا، ارم ستونوں والے جن جیسا اس زمانہ میں کوئی نہ تھا۔

قوم عاد کی ہدایت کے لیے ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا گیا، اس قوم نے نافرمانی کی اور عذاب الٰہی نے اسے ہلاک کر دیا۔

قوم ثمود کا تعلق علاقہ ''حجر'' سے تھا، اس کی ہدایت کے لیے حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے، انھوں نے بھی راہِ ہدایت سے گریز کیا اور یہ لوگ بھی ہلاک ہو گئے۔

''طسم'' و''جدیس'' کا مقام یمامہ تھا۔ ''عمالقہ'' تہامہ میں رہتی تھی اور ''جرہم'' اولی یمن میں رہتی تھی۔

یہ سب سامی قبائل تھے، اپنے اپنے وقت پر حکمرانی کرتے رہے اور ہلاک ہوتے رہے پھر بھی ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں عرب کے مختلف حصوں میں بنو قحطان کے با اقتدار ہونے تک قائم رہیں مگر ابھرتی ہوئی قوت کا مقابلہ نہ کر سکیں اور یا تو سب کے سب ہلاک ہو گئے یا کسی طرف نکل گئے اور عرب میں اپنا نشان نہ چھوڑا۔ اسی لیے تاریخ عرب میں اس طبقہ کو عرب ''بائدہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دوسرا طبقہ عرب متعربہ کہلاتا ہے، یہ بھی سامی ہیں ارفخشذ بن سام بن نوح کی اولاد میں قحطان گذرا ہے، اس کی اولاد قحطانی کہلاتی ہے۔ تورات میں ''قحطان'' کا ذکر نہیں ملتا، البتہ ''یقطن'' کا نام آیا ہے، یہ بات قرین قیاس ہے کہ ''قحطان'' اسی ''یقطن'' کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

قحطان اور اس سے پہلے کے لوگ عرب نہیں تھے اور نہ عربی بولتے تھے، اس کے بیٹے ''یعرب'' نے عرب بائدہ کے ساتھ رہ کر عربی سیکھی، اسی لیے کہا جاتا ہے **اول من تکلم بالعربیة یعرب ابن قحطان**۔ وہ پہلا شخص جس نے عربی میں بات کی یعرب بن قحطان تھا۔

یعرب بن قحطان نے عرب بائدہ کا بالکلیہ خاتمہ کر دیا اور نئے عرب خاندان کی بنیاد ڈالی، قحطانی قبائل تمام عرب پر چھا گئے اور بڑی بڑی حکومتیں بنائیں، ان میں بڑے بڑے نامور بادشاہ گذرے ہیں۔

قحطانی قبائل کا اصل مقام یمن سمجھا جاتا ہے، بعضوں کا خیال ہے یعرب بن قحطان کا نام ''یمن'' بھی تھا، اس حصہ کو اس نے ہی آباد کیا اور اسی کی نسبت سے ملک کا یہ حصہ یمن کہلایا۔

بنوقحطان میں دو قبیلے بہت نامور ہوئے ہیں ''حمیر'' اور ''ازد''۔ شام کی سرحد پر غسانی حکومت ''ازد'' کی ہی شاخ تھی۔ ''حیرہ'' کے بادشاہ ''مناذرہ'' بھی قحطانی تھے۔ ''غسانہ'' چونکہ سلطنت روم کی سرحد سے متصل تھے اس لیے وہ ان کے زیر اثر تھے اور حیرہ کے مناذرہ سلطنت فارس سے وابستہ تھے، ظہور اسلام کے وقت قحطانی عربوں کا عرب کے اکثر علاقوں میں اثر تھا۔

تیسرا طبقہ عرب مستعربہ کہلاتا ہے، یہ بھی سامی الاصل ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کا اصل وطن تو سرزمینِ عراق تھی مگر انھوں نے اپنی بیوی ہاجرہ اور بیٹے اسمٰعیل علیہما السلام کو حجاز کے علاقہ میں آباد کر دیا جہاں آج مکہ واقع ہے۔

اسمٰعیل علیہ السلام نے بنوقحطان کی ایک شاخ جرہم (الثانیہ) کے ساتھ پرورش پائی اس طرح یہ عربی سیکھ گئے اور ان کی اولاد عربوں کا تیسرا طبقہ ہوئی۔

بنو اسمٰعیل قحطانیوں کے زیر اثر رہے، یہاں تک کہ ان میں ''عدنان'' کو طاقت حاصل ہوئی اور اس کے بعد یہ عرب عدنانی کہلائے۔ عدنانیوں نے حجاز کی سرداری حاصل کری اور چونکہ ''مکہ'' مذہبی مرکز بھی تھا اور عدنانی اس کے متولی تھے اس لیے پورے عرب میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔

عدنانی قبیلوں میں ''ایاد''، ''ربیعہ'' اور ''مضر'' سب سے مشہور ہیں۔ مضر کی شاخ کنانہ میں ''فہر بن مالک'' سب سے مشہور گذرا ہے جسے ''قریش'' بھی کہتے ہیں۔ قریش کو سب سے معزز سمجھا جاتا ہے اور اسی کی اولاد میں اسلام کی دعوت عام دینے والے اللہ کے آخری رسول ﷺ ہیں، تاریخ اسلام کی بڑی بڑی شخصیتیں قریش سے ہی متعلق ہیں۔

''خزاعہ'' نے جو قحطانی قبیلہ تھا عدنانیوں کو مکہ سے مار بھگایا، مختلف قبائل مختلف حصوں میں آباد ہو

گئے۔ مکہ کے قرب و جوار میں قریش رہے مگر ان میں بھی نا اتفاقی تھی اس لیے مکہ کی سیادت حاصل کرنے کی ہمت نہ ہوئی، یہاں تک کہ قُصی ابن کلاب نے سب کو متحد کیا، مکہ فتح کیا اور پورے حجاز پر اقتدار حاصل کر لیا، اس طرح قُصی کے زمانہ سے خانۂ کعبہ کی تولیت پھر عدنانیوں کے قبضہ میں آ گئی، ''قصی'' نے دو کام کیے ایک تو یہ کہ ایک بڑا مکان تعمیر کیا اور اس کا نام ''دارالندوہ'' رکھا جس میں بیٹھ کر تمام سرداران قریش مشورہ کریں، یہ گویا حکومت کا اسمبلی ہال تھا۔ دوسرے قصی نے طے کیا کہ کعبہ کا حج کرنے کے لیے جو حاجی آئیں ان کی خاطر داری کی جائے اور تین دن تک ان کے کھانے کا انتظام ہو، اس کے اخراجات تمام سرداران قریش ادا کریں، یہ گویا ایک قسم کا ٹیکس نافذ کیا گیا۔

قُصی کے بعد اس کے بیٹے عبدالدار کو سیادت حاصل ہوئی، عبدالدار کے بعد سرداری کے لیے عبدالدار اور عبد مناف (عبدالدار کا بھائی) کی اولاد میں اختلاف ہوا، تصفیہ یہ ہوا کہ دارالندویہ کا انتظام بنو عبدالدار کے سپرد رہے اور خانہ کعبہ کی تولیت، حجاج کی ضیافت اور ٹیکس کی وصولی بنو عبد مناف کو دی جائے، چنانچہ عبد مناف کے لڑکے عبد شمس کو کعبہ کی تولیت حاصل ہوئی پھر عبد شمس نے اپنی زندگی میں ہی یہ ذمہ داری اپنے بھائی ہاشم کے سپرد کر دی اور طلوع اسلام تک یہ اعزاز بنو ہاشم کو ہی حاصل رہا۔

جاہلیت میں نظام حکومت:

ملک عرب کا اکثر حصہ صحرائی ہے، پہاڑیاں بھی بے آب و گیاہ ہیں اس لیے وہاں کے باشندوں کو زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کی اوّل ترین ضرورتوں کو فراہم کرنے کے لیے خانہ بدوشانہ زندگی گذارنا پڑتی تھی، صرف ساحلی علاقہ یا یمن کا زرخیز حصہ تو اس قابل ہے جہاں آدمی شہر بنا کر رہ سکے، اس لیے عام طور پر عرب شہری زندگی سے دور رہے۔ بدوی (خانہ بدوش) ہونا ان کے خیال میں شرافت کی نشانی تھا اور اس پر وہ فخر کرتے تھے۔

اگر چہ عرب میں شہر بھی بسے اور اس میں تمدن بھی پروان چڑھا جس کا ثبوت کھدائیوں اور قدیم آثار سے ملتا ہے، مگر عربوں کے قبائل عام طور پر شہری زندگی سے متنفر تھے اس لیے ان کا تمدّن اور خصوصیات بالکل منفرد ہیں۔

عربوں کی تہذیب بادیہ نشین تہذیب کہلائی جاسکتی ہے۔ ہر شخص کو انفرادی آزادی حاصل تھی، اجتماعی امور میں وہ سردار قبیلہ کے ماتحت ہوتے تھے، ان کے نظام اجتماعی کو ہم یوں بیان کرسکتے ہیں:

(۱) سردار قبیلہ- وہ عام طور پر سب میں معمر آزمودہ کار اور اچھا خطیب یا شاعر ہوتا تھا، لڑائی کے میدان میں اس کا حکم ویسے ہی مانا جاتا جیسے وہ مطلق العنان بادشاہ ہو، اس کا اعلانِ جنگ پورے قبیلہ کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھا جاتا اور اس کا صلح کرلینا سب کے لیے قابل قبول ہوتا۔ سردار قبیلہ کے اختیارات صلح، جنگ اور دیت (خون کا بدلہ) تک ہی محدود ہوتے، کسی کے ذاتی معاملات میں وہ بالکل مداخلت نہ کرسکتا۔

(۲) قبیلہ- بہت سے گھروں (خیموں) کا مجموعہ قبیلہ کہلاتا۔ یوں تو ہر خیمہ بجائے خود علیحدہ اسٹیٹ کا حکم رکھتا مگر ایسے معاملات میں جس سے کسی کی عزت پر حرف آتا ہو پورا قبیلہ مجموعی طور پر حرکت میں آجاتا اور لڑائی کے میدان میں سب ایک ہوتے، اس طرح کوئی فخر حاصل ہوجاتا تو اس کی خوشی میں بھی سب برابر کے شریک ہوتے۔

(۳) بیت- ایک خیمہ میں رہنے والے "بیت" کہلاتے۔ اس میں عام طور پر بزرگ باپ ماں اور ان کی وہ اولاد شامل ہوتی جس کی شادی نہ ہوئی ہو۔ ان میں باپ بزرگ خاندان ہوتا اور ماں اس کی رفیق کار، پورے افراد خاندان پر باپ کا حکم بادشاہ کی طرح چلتا تھا، گھر کے اندرونی کاروبار میں ماں خود مختار ہوتی تھی۔ بچے بہرحال ماں باپ کے تابع فرمان ہوتے تھے۔

اس طرح عرب تمدّن میں، حکومت میں، باپ، قبیلہ اور سردار قبیلہ تینوں اپنی اپنی جگہ اختیارات کے حامل تھے اور ان کے احکام یا مفادات کے زیر اثر ہر فرد کو عمل کرنا پڑتا تھا۔

اس سہ گانہ اقتدار کے باوجود انفرادی طور پر ہر ایک آزاد تھا اور اس کے ذاتی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کی جاسکتی تھی۔

جاہلیت میں ادیان:

عرب قوم خانہ بدوشانہ زندگی گذارتی تھی اور اس زندگی میں دلوں کے اندر نوامیس فطرت کا خوف فطری ہے اس لیے اس کے معتقدات میں ہمیں ستارہ پرستی، آتش پرستی اور بت پرستی سبھی نظر

آتے ہیں۔

غالباً وہاں کا سب سے قدیم مذہب ستارہ پرستی ہی رہا ہوگا کیونکہ ستارے انھیں راستہ بھی دکھاتے تھے اور موسموں کا پتہ بھی دیتے تھے جس سے انھیں آسانیاں میسر آئیں یا تکلیفیں پہنچیں۔

آتش پرستی بھی عرب کے بعض قبائل میں رائج تھی ممکن ہے یہ ایران کے ذریعہ سے پہنچی ہو کیونکہ حیرہ کے عرب فرماں رواؤں کا دربارِ ایران سے ربط تھا اور وہ ایرانی سیادت کو تسلیم کرتے تھے۔

بت پرستی عرب میں سب سے زیادہ رائج تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں حجاز کا بادشاہ عمرو بن لحی بن حارثہ شام کی طرف گیا وہاں اس نے لوگوں کو بت پرستی کرتے دیکھا اسے تعجب ہوا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ ارباب (رب کی جمع) ہماری دستگیری کرتے ہیں، تو اس نے ان سے خواہش کی کہ وہ اسے بھی ایک بت دیں جسے وہ ساتھ لے جائے۔ سب سے پہلے جو بت عرب علاقہ میں لایا گیا وہ ''ہبل'' تھا، عمرو بن لحی بن حارثہ نے ہبل کو خانہ کعبہ میں رکھا اور اس کی پرستش کا حکم دیا، اس کے شاہی اثر اور کعبہ کے سب کے دلوں میں گھر کیے ہونے کی وجہ سے، بہت جلد بت پرستی عرب قوم میں عام ہوگئی۔

جاہلیت میں بت پرستی نے یہ شکل اختیار کر لی کہ عرب کے ہر قبیلہ نے اپنا الگ بت بنا ڈالا اور اس کی پوجا شروع کر دی۔ خود خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھ دیئے گئے اور انھیں پوجا جانے لگا۔

چند بتوں کے نام یہ ہیں جو سب میں مشہور تھے:

(۱) ہُبل- بڑا بت جو خانہ کعبہ پر رکھا ہوا تھا۔

(۲) عُزّیٰ- یہ بت قریش کا بڑا بت تھا۔

(۳) لات- ثقیف کا بڑا بت تھا، طائف میں اس کی پوجا ہوتی تھی۔

(۴) منات- مدینہ کے اوس وخزرج کا بت تھا۔

(۵) اَسَاف اور نائلہ- دو بت تھے جو صفا اور مروہ پر رکھے ہوئے تھے۔

(۷) سُواع- ہذیل کا بت تھا (عورت کی شکل تھی)

(۸) یغوث- مذحج کا بت تھا (شیر کی صورت)

(۹) یعوق- ہمدان کا بت تھا (گھوڑے کی صورت)

(۱۰) نسر- ذوالکلاع کا بت تھا (حمیر میں گدھ کی صورت)

''اساف'' اور ''نائلہ'' کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں دوسرداروں کے لڑکا لڑکی تھے، کعبہ میں بدکاری کی اور عذابِ الٰہی نے انھیں پتھر بنادیا۔

(۱۱) وُد- قبیلۂ بنو کلب کا بت تھا (ود کی صورت)

یغوث، یعوق اور نسر آدم علیہ السلام کی اولاد بتائے جاتے تھے، وہ بہت متقی تھے جب ان کا انتقال ہوگیا تو شیطان نے لوگوں کو بہکایا کہ ان متقیوں کے بت عبادت خانہ میں رکھے جائیں اور پھر ان کی پوجا شروع ہوگئی۔

ستارہ پرستی، آتش پرستی اور بت پرستی کے علاوہ عرب میں ''دہری'' بھی تھے ان کا خیال تھا کہ اس زندگی کے بعد اور کوئی زندگی نہیں۔ حشر نشر، سزا جزا سب کہنے کی باتیں ہیں، ایک شاعر کہتا ہے:

حیات ثم موت ثم حشر — کلام خرافة یا ام عمرو

زندگی پھر موت پھر اٹھنا — اے ام عمرو! یہ سب خرافات ہے

آسمانی مذاہب میں عیسائیت اور یہودیت بھی عرب کے بعض علاقوں میں اسلام سے پہلے رائج تھی۔

یثرب (مدینہ) کے قرب و جوار میں یہودی آباد تھے، یہ ان اسرائیلیوں کی اولاد تھے جو شام سے نکل کر یہاں آباد ہو گئے تھے، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک فوج روانہ کی تھی اور اسے حکم تھا کہ غلبہ حاصل کر کے مخالفین کو زندہ نہ چھوڑو جب یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد شام واپس ہوئے تو وہاں کے لوگوں نے انھیں وہاں رہنے نہ دیا اور مجبوراً یہ لوگ یثرب کے قریب آباد ہو گئے۔

قبیلہ بنو کنانہ اور بنو حارث وغیرہ میں یہودیت پھیل گئی تھی، عرب جاہلیت کا مشہور بڑا شاعر سیموئل بن عادیا یہودی تھا۔

عیسائیت غسان، ربیعہ اور قضاعہ میں پائی جاتی تھی، غسانی بادشاہوں کو قیصر روم کے دربار میں

بڑا مرتبہ حاصل تھا، اسی کا اثر تھا کہ بنو غسان میں عیسائیت کا فروغ ہوا۔

طلوع اسلام سے پہلے ستارہ پرستی، آتش پرستی، بت پرستی، دہریت، یہودیت اور عیسائیت کے علاوہ بہت مختصر لوگوں میں صرف وحدانیت بھی پائی جاتی تھی، یہ لوگ گنتی کے تھے جو تمام مشرکانہ عقائد سے بیزار تھے۔ خود کو اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کا پیرو مانتے تھے مگر چونکہ دین کی تفصیلات سے باخبر نہ تھے اس لیے صرف برائیوں سے بچنے کو ہی کافی سمجھتے تھے اور بتوں وغیرہ کی پرستش نہیں کرتے تھے۔

اخلاق ومعائب:

عرب قوم اپنے ملک کے طبعی حالات کی بنا پر عام طور پر خانہ بدوشانہ زندگی کی عادی تھی، اس خانہ بدوشانہ زندگی نے انھیں سختیاں برداشت کرنے کا خوگر بنا دیا تھا اور بے مثال بے خوفی ان کی خصوصیت بن گئی تھی اس لیے ان کے اخلاق میں بنیادی طور پر شجاعت کو شمار کرنا چاہیے۔

شجاعت عرب میں عام تھی، مگر اس کا استعمال انفرادی یا قبائلی مفاد کے لیے ہی ہوتا تھا، قومی یکجہتی کے فقدان کے باعث عرب جیسی بہادر قوم نے اسلام سے پہلے کوئی کارنامہ نہیں دکھایا۔

بہادری وہ اعزاز تھا جس کی بدولت بڑے سے بڑا مرتبہ حاصل ہو سکتا تھا، کسی نوجوان سے کوئی بہادری کا کارنامہ انجام پاتا تو سب لوگ جشن مناتے، اپنی بہادری کے باعث جنھوں نے مرتبہ حاصل کیا ہے ان میں صاحب معلقہ عنترہ کا نام خاص طور پر لیا جانا چاہیے باوجودے کہ وہ ایک ذی عزت باپ کا بیٹا تھا مگر اسے گھر سے نکال دیا گیا تھا کیونکہ اس کی ماں ایک حبشی کنیز تھی اور اس کا سیاہ رنگ اس کے بیٹے نے بھی وراثت میں پایا تھا۔

عنترہ نے باپ رکھتے ہوئے بھی یتیم ولاوارث کی سی زندگی گذاری، اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرتا تھا مگر جب اس نے میدان شعر میں اپنی فصیح بیانی اور میدان کارزار میں اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھائے تو اس کے باپ نے بڑے فخر سے اسے اپنا بیٹا تسلیم کر لیا اور خاندان میں شامل کر لیا۔

ایام العرب:

جاہلیت میں اشہر حرم (ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) کے علاوہ کوئی زمانہ جنگ آزمائی سے

خالی نہیں ملتا، کسی نہ کسی قبیلہ کی ایک دوسرے سے ٹھنی رہتی تھی۔

ان لڑائیوں کو ''ایام العرب'' کہا جاتا ہے، مشہور مشہور لڑائیوں کے نام بھی سوسوا سو تو ہوں گے ہی۔ خاص خاص لڑائیاں یہ ہیں:

(۱) یوم بعاث

(۲) حرب بسوس

(۳) ذی قار

یوم بعاث:

اوس اور خزرج میں دشمنی چلی آتی تھی، اوس نے یہودی قبیلوں بنی قریظہ اور بنی نضیر کی مدد حاصل کی اور مدد کے لیے بلایا تا کہ ایک بار خزرج سے فیصلہ کن لڑائی ہوجائے۔

خزرج کے سردار کو معلوم ہوا کہ انھوں نے دوسرے قبیلوں سے مدد مانگی ہے تو اس نے انھیں پیام بھیجا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان پہلے سے کوئی دشمنی نہیں ہے، انھوں نے غیر جانبداری کا وعدہ کیا۔ خزرج نے ضمانت طلب کی تو انھوں نے اپنے ۴۰ نوجوان ضمانت کے طور پر بھیج دیے جنھیں خزرج کے سرداروں کے گھروں میں رکھا گیا۔

خزرج کے ایک ایک سردار نے اپنے لوگوں سے کہا کہ ان قیدیوں کی وجہ سے بڑی تکلیف ہے ہم ان کی حفاظت کریں یا اپنے کام دیکھیں اور قسم کھائی کہ وہ اپنا سر اس وقت تک نہیں دھوئے گا جب تک بنو قریظہ اور بنو نضیرہ کے گھروں پر قبضہ نہ کرلے اور انھیں پیام دیا کہ یا تو وہ یہ علاقہ خالی کردیں تا کہ ہم اس میں رہیں یا ہم ان کے ان نوجوانوں کو قتل کردیں گے جو ہمارے پاس بطور یرغمال ہیں۔

بنو قریظہ نے علاقہ چھوڑ دینا چاہا مگر ان کے سردار کعب بن اسد قرظی نے کہا کہ اپنے گھروں کی حفاظت کرو انھیں کہلا بھیجو کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو قتل کردیں، خدا کی قسم ایک آدھ رات کی بات ہے ہر شخص کے بچے پیدا ہوں گے جو ویسے ہی ہوں گے جیسے ضمانت میں دیے گئے تھے۔ اس تقریر سے ان کی ہمتیں بڑھیں اور انھوں نے کہلا بھیجا کہ ہم علاقہ خالی نہیں کریں گے، ہم نے ضمانت کاہے کے لیے دی تھی اس پر غور کرو۔

خزرج کے سردار عمرو بن نعمان نے یہودی نوجوانوں کو قتل کر ڈالا جو اس کے قبضہ میں تھے۔ دوسروں نے بھی اس کا اتباع کیا مگر عبداللہ ابن ابی نے ایسا نہیں کیا اور کہا کہ یہ حق تلفی، گناہ اور سرکشی ہے، میرے ساتھی بھی اس معاملہ میں تمہارے شریک نہیں ہوں گے اور ان نوجوانوں کو رہا کر دیا جو اس کے اور اس کے ساتھیوں کے پاس قید تھے۔

اسی دن اوس اور خزرج میں ایک چھوٹی سی جھڑپ ہوئی، بنوقریظہ اور بنونضیر نے بالاتفاق طے کیا کہ اوس کی مدد کی جائے، اوس سے کہلا بھیجا کہ ہم تمہاری آخر دم تک مدد کریں گے تم اپنے ناتجربہ کار نوجوانوں کو ہمارے گھروں میں اتار دو اور ہم سب مل کر خزرج کا نام ونشان مٹادیں۔ اوس نے اسے قبول کرلیا اور میدان میں نکل آئے، دوسرے غسانی قبیلوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

خزرج کو اس اتحاد کی اطلاع آئی تو انھوں نے سرداروں کا اجتماع کیا، عمرو بن نعمان نے تقریر کی کہ اوس نے یہودیوں سے رشتہ جوڑا ہے ہم ان سے جنگ کریں گے اور جب انھیں شکست دے دیں گے ان میں سے ایک فرد کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ تو عبداللہ بن ابی نے خطبہ دیا ''کہ تمہارا یہ اعلان سرکشی اور حقوق کی پامالی ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں یہ ہمارے بھائی بند نہیں، انھوں نے ہم پر زندگی تنگ کر رکھی ہے تو کیا یہ ہماری موت کو بھی روک سکیں گے، خدا کی قسم، میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ قوم ختم نہیں ہوگی بغیر تمہارے عوام کو ہلاک کیے ہوئے، مجھے ڈر ہے کہ وہ ختم نہیں ہوں گے کیونکہ تم نے ظلم کیا ہے اس لیے اسی انداز سے لڑو جیسے ہمیشہ لڑتے آئے ہو، اگر وہ پیٹھ دکھائیں تو تم لڑائی روک دو اور اگر تم کو شکست ہو تو قریب ترین مکان میں گھس جاؤ اور وہ لڑائی بند کر دیں''۔

عمرو بن نعمان نے کہا کہ اے ابوحرث! جبکہ اوس اور یہودیوں کے اتحاد کی خبر تجھے معلوم ہوئی تو تیرا دماغ چل گیا، عبداللہ نے کہا میں نے ہمیشہ تمہارا ہر میدان میں ساتھ دیا ہے مگر اس دفعہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تیری میت چار آدمی اٹھا کے لا رہے ہیں۔

خزرج کی ایک جماعت نے عبداللہ بن ابی کی نصیحت مان لی مگر بہت سوں نے عمرو بن نعمان کو اپنا سردار بنالیا اور لڑائی کی تیاری کرنے لگے، چالیس دن دونوں جماعتوں نے لڑائی کی تیاری کی اور اپنے مددگار قبیلوں کو پیامات بھیجے۔

بنو قریظہ کا ایک مزرعہ تھا جس کا نام بعاث تھا وہاں دونوں طرف کی فوجوں کا سامنا ہوا اسی لیے اس لڑائی کو یوم بعاث یا حرب بعاث کہتے ہیں۔

جب دونوں لشکر آمنے سامنے آئے تو اوس کو خزرج کے لشکر کی عظمت سے ڈر محسوس ہوا اور انھوں نے اپنے سردار سے کہا کہ اپنے ساتھیوں کو بلانے تک انتظار کرنا چاہیے، سردار حضیر نے کہا کہ میں مزنیہ کا انتظار کرتا ہوں جب کہ قوم نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میں نے انھیں دیکھ لیا ہے۔ یہ کہہ کر اپنی کمان غصہ سے پٹک دی اور لڑائی شروع کر دی۔

لڑائی کی ابتدا میں ہی اوس کے پاؤں اکھڑ گئے اور خزرج نے انھیں بھاگتا دیکھ کر آوازے کسے جس پر سردار حضیر (اوس کا کماندار) نے اپنے نیزہ سے اپنی ران زخمی کر لی اور قوم سے کہا اگر تم مجھے دشمن کے حوالہ کرنا پسند کرو تو میدان سے بھاگ جاؤ، میں تو بھاگ نہیں سکتا۔ اس پر اوس پلٹ پڑے اور گھمسان کی لڑائی ہوئی، ایک تیر خزرج کے سردار عمرو بن نعمان کے آ لگا جس سے وہ فوراً ختم ہو گیا۔

سردارِ خزرج کے مارے جانے سے لڑائی کا نقشہ پلٹ گیا اور اوس نے خزرج کے گھر اور مزرعے جلا ڈالے، اوس نے اپنے زخمی سردار کو کاندھوں پر اٹھا لیا اور رجز کے گیت گائے، پھر لوگوں نے بڑی مشکل سے لڑائی ختم کرائی۔

حرب بسوس:

وائل کے دونوں لڑکوں کی اولاد علیحدہ علیحدہ قبیلے بن گئی، ''تغلب'' اور ''بکر''۔ تغلب کے سرداروں میں مہلہل اور اس کا چھوٹا بھائی کلیب تھے اور بکر کے سرداروں میں ہمام اور حساس دو بھائی تھے، ان میں تعلقات قرابت بھی تھے اور دوستی بھی۔ مہلہل اور ہمام میں بہت گہری دوستی تھی اور حساس کی بہن کلیب سے منسوب تھی۔

کلیب کو اپنی سرداری کا بے انتہا غرور تھا، وہ جس جگہ چاہتا قیام کرتا اس جگہ چراگاہیں اور پانی کے چشموں کو دوسروں کے لیے بند کر دیتا، اس کی بغیر اجازت اس کے علاقہ سے کوئی گذر بھی نہیں سکتا تھا، لوگ اس کے ظلم سے تنگ تھے مگر اس کے ڈر کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔

ایک روز کلیب کے سر کے بال اس کی بیوی دھلا رہی تھی، کلیب نے اپنی بیوی سے پوچھا بتاؤ

''وائل'' کی اولاد میں سب سے بڑا کون ہے؟ وائل میں اس کا خاندان بھی شامل تھا اور اس کے شوہر کا بھی، وہ اپنے بھائیوں کو ذلیل نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے جواب دیا میرے دونوں بھائی ہمام اور جساس سب سے بڑے ہیں، اس جواب سے کلیب کی انا مجروح ہوئی اور اس نے طے کر لیا کہ ہر طرح وہ اپنی بیوی کے گھر والوں کو ذلیل کرے گا۔

کلیب مختلف شرارتیں کرتا رہا اور اس کے سالے ہمام اور جساس ٹالتے رہے مگر ایک روز کلیب کی حرکتیں نا قابل برداشت ہو گئیں اور جساس نے اس کا کام تمام کر دیا۔

جساس کی خالہ بسوس نامی اس کے پاس مہمان تھی، بسوس کی اونٹنی جو بہت دودھ دیتی تھی، چرتی ہوئی اس طرف چلی گئی جس طرف کلیب نے اپنے لیے چراگاہ مخصوص کر رکھی تھی، اس نے توہین کے ارادہ سے اونٹنی کے تھن تیر مار کر زخمی کر دیے، اونٹنی زخمی حالت میں واپس آئی تو جساس نے کلیب سے جواب طلب کیا، بات بڑھی اور جساس نے اسی وقت نیزہ کا وار کیا جو کلیب کے لیے قاتل ثابت ہوا۔

جساس کلیب کو قتل کرنے کے بعد اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر بھاگ گیا، اس وقت ہمام اور مہلہل بیٹھے باتیں کر رہے تھے، ہمام نے جو جساس کو گھوڑے کو تیزی سے بھگاتے دیکھا تو اسے تعجب ہوا اور اس نے کہا ''غالباً کوئی بڑی بات ہوئی ہے ورنہ جساس اس طرح گھوڑا نہیں بھگایا کرتا'' اٹھ کر لوگوں سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ جساس کلیب کو قتل کر کے کہیں چل دیا، مہلہل نے ہمام سے پوچھا ''کیوں کچھ پتہ چلا''؟ تو ہمام نے جواب دیا ''کہتے ہیں کہ میرے بھائی جساس نے تیرے بھائی کلیب کو قتل کر ڈالا ہے''۔ مہلہل کو یقین نہیں آیا اور اس نے کہا ''یہ کام اس کے بس کا نہیں''، مگر کلیب واقعتاً قتل ہو چکا تھا۔

بنو تغلب کلیب کا بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے مگر لوگوں نے سمجھایا کہ خوں ریزی سے زیادہ اچھا ہے کہ بات چیت سے معاملہ طے ہو جائے، تغلب کا وفد بکر کے سردار مرہ بن ذہل کے پاس آیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ جساس کو پکڑ کر ہمارے حوالے کر دے تا کہ ہم اسے بدلے میں قتل کر دیں، وہ نہ ملے تو پھر جساس کے بھائی ہمام کو دے دو ہم اسے بدلے میں قتل کر دیں، اسے بھی نہ دو تو پھر اپنے آپ کو حوالے کر دو ہم اپنے سردار کے بدلے میں تمہیں قتل کر دیں گے ورنہ پھر عام خونریزی ہو گی اور بہت سے بے گناہ مارے جائیں گے۔

سردار بنو بکر ''مرہ'' پہلے تو خاموش رہا مگر جب اس کے قبیلے والوں نے اصرار کیا کہ صاف صاف جواب دے دو تو اس نے کہا ''جساس ایک پھرتیلا نوجوان ہے نہ جانے کہاں گیا اس کا ہاتھ آنا ممکن نہیں، ہمام کے بہت سے بچے ہیں اگر اسے بے گناہ قتل کرنے کے لیے تمہیں دے دوں تو اس کے بچے مجھ سے رو رو کر فریاد کریں گے تو میں کیا جواب دوں گا؟ رہا میں تو میرا معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر بھی تم مجھ سے بدلہ لینا چاہو تو میرے دس نوجوان لڑکوں میں سے جسے چاہو پکڑ کر قتل کر دو، میں تو ایسے قتل نہیں کیا جا سکتا، ہاں میدان میں سب سے آگے میں ہی رہوں گا اور وہاں کوئی بھی مجھے قتل کر سکتا ہے''۔

اس سوال جواب کے بعد لڑائی شروع ہوئی، یہ لڑائی حرب بسوس اس لیے کہلاتی ہے کہ بسوس کی اونٹنی کا زخمی کیا جانا اس لڑائی کی بنیاد بنا، یہ لڑائی مسلسل چالیس سال تک جاری رہی، مختلف معرکے ہوئے، کسی میں تغلب کا پلہ بھاری رہا اور بکر کا کوئی نہ کوئی سردار کام آیا اور کسی معرکہ میں بکر کامیاب رہے اور تغلب کا کوئی نہ کوئی بڑا آدمی مارا گیا، مختلف قبیلے کسی نہ کسی طرف شریک ہوتے گئے اور مسلسل لڑتے رہے۔

آخری معرکہ میں بکر کی سرداری حرث بن عباد کر رہا تھا، اتفاق سے اس نے مہلہل کو (جو تغلب کا سب سے بڑا سردار تھا اور اسی کی وجہ سے یہ معرکہ آرائی جاری تھی) گرفتار کر لیا، مگر پہچان نہ سکا کہ یہ مہلہل ہی ہے ورنہ اسے قتل کر دیتا اور لڑائی کا خاتمہ ہو جاتا، حرث نے قیدی سے کہا ''اگر تو مہلہل کا پتہ بتا دے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا''۔ قیدی نے کہا اچھا اگر میں مہلہل کا صحیح پتہ بتا دوں تو میری جان محفوظ رہے گی؟''۔ حرث نے وعدہ کیا ''قیدی نے کہا تو سنو میں ہی مہلہل ہوں''۔ حرث مجبور ہو گیا اور اسے آزاد کر دیا اور اس سے پوچھا ''اچھا تو بتاؤ کہ میرے لڑکے کا بدل تمہارے پاس کون ہو سکتا ہے اور کہاں ملے گا؟''، مہلہل نے بتایا کہ ''امرالقیس بن آبان ہو سکتا ہے''۔ مہلہل کو چھوڑ کر حرث نے ابن آبان کو قتل کر دیا، مہلہل اس شکست کے بعد پھر لڑائی کے میدان میں واپس نہیں آیا۔

لڑائی ختم ہو گئی مگر اصل شخص جس کے قتل کرنے کے لیے یہ ساری خونریزی ہوئی، جساس زندہ رہا، جساس نے اپنی بہن کلیب کی بیوی کو اپنے پاس رکھا تھا، جس وقت کلیب قتل ہوا اس وقت اس کی

بیوی حاملہ تھی، اس کے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ہجرس رکھا گیا، اس بچے کی پرورش جساس نے اپنے لڑکے کی طرح کی اور جب وہ جوان ہوگیا تو اس کی شادی اپنی لڑکی کے ساتھ کر دی۔

ہجرس جساس کے ساتھ ہی رہتا تھا اور اسے ہی اپنا باپ سمجھتا تھا، لڑائی ختم ہو جانے کے بعد ایک روز بکر کے نوجوانوں نے اسے چھیڑا، وہ گھبرایا ہوا واپس آیا اور اپنی ماں سے اپنے باپ کے متعلق تفصیلات معلوم کیں، یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اس کے باپ کو اس کے ماموں نے قتل کر دیا تھا اور اسی سلسلہ میں برسہا برس لڑائیاں ہوتی رہیں، اس کا خون کھولنے لگا، رات کو جب اس کی بیوی اس کے پاس گئی تو اس نے کچھ ایسی چیخ ماری کہ یہ گھبرا کر اپنے باپ کے پاس آئی اور اسے بتایا کہ ہجرس اپنے باپ کے غم میں پاگل ہو رہا ہے۔

صبح کو جساس نے اسے پورا واقعہ بتایا اور کہا کہ ''بہت خونریزی ہو چکی ہے اب جا کر لڑائی ختم ہوئی ہے، میں نے تمہیں پال پوس کر اتنا بڑا کیا اب اگر تم اپنے لوگوں میں جانا چاہو تو میں نہیں روکوں گا''، ہجرس اپنے قبیلہ والوں کے پاس جانے کے لیے نکلا، جساس اسے رُخصت کرنے کے لیے آیا، ہجرس نے کہا ''مجھ جیسا آدمی بغیر بدلہ لیے اپنی قوم کے پاس نہیں جا سکتا'' جساس نے لوگوں کو بتایا کہ ''تم لوگ جس مصیبت سے گذر چکے ہو یہ نوجوان اسی میں گھرنا چاہتا ہے''، اس کے بعد ہجرس نے رجز پڑھتے ہوئے نیزہ کا وار کیا اور اپنے باپ کے قاتل، اپنے ماموں اور خسر کو قتل کر دیا، اس طرح اس منحوس لڑائی کا خاتمہ بنو بکر کے سردار جساس کے قتل پر ہوا۔

ذی قار:

ذی قار بکر بن وائل کا ایک چشمہ ہے اس جگہ دو دفعہ عرب و عجم کی ٹکر ہوئی، پہلی بار سردار بکر حنظلہ نے وہاں اپنا مشہور خیمہ ''سرخ قبہ'' لگایا اور سیر و شکار میں مشغول رہا۔ سواد عراق کے ایرانی حاکم نے بنو بکر کو وہاں سے نکال دینا چاہا جس پر جھڑپ ہوگئی اور عجمی سردار کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اس مختصر لڑائی کو یوم ''ذی قار اول'' یا ''یوم قبّہ'' کہتے ہیں۔

یوم ذی قار ثانی کا معرکہ عرب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں ان کا مقابلہ ایران کی منظم فوج اور ایران کے زیر اثر عرب قبیلوں کے سرداروں سے ہوا اور بنو بکر اور ان کے حلیفوں

نے ایسا جم کر مقابلہ کیا کہ عجمیوں کو شکست فاش ہوئی اور عربوں نے ان کا تعاقب کر کے انھیں قتل کیا اور بے شمار مال غنیمت حاصل کیا۔

عرب کا بادشاہ نعمان ابن المنذر ایران کے دربار سے متعلق تھا، کسریٰ پرویز اس سے ناراض ہو گیا اور اسے دربار میں طلب کیا، نعمان نے محسوس کیا کہ اس کا انجام یقینی ہلاکت ہوگا، اس لیے وہ اپنی اولاد، ساز و سامان اور ہتھیار لے کر بنو بکر کے سردار ہانی بن مسعود کے پاس آیا اور سب کا اسے امانت دار بنایا۔

نعمان نے پھر دوسرے قبیلوں کا رُخ کیا جن سے قرابت قریبہ تھی مگر انھوں نے اپنے پاس اسے پناہ دینے میں جھجک محسوس کی، بنو رواحہ بن عبس نعمان کے پاس آئے، اسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی اور یقین دلایا کہ وہ آخری قطرۂ خون تک اس کی حفاظت کریں گے مگر نعمان نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے دوسروں کو مصیبت میں پھنسا دے، اس لیے وہ سیدھا کسریٰ پرویز کے پاس پہنچ گیا جہاں اسے قید کر دیا گیا اور وہیں اس نے جان دی۔

بنو بکر ذی قار سے نکل کر اکثر سواد عراق پر حملے کرتے رہتے تھے اور لوٹ مار مچاتے رہتے تھے، دربار ایران سے قیس بن مسعود کو حکم ملا کہ وہ بنو بکر کی روک تھام کرے، قیس نے بڑا مہمان خانہ بنایا اور سب کی خاطر مدارات کر کے ہر دل عزیزی حاصل کر لی اور بنو بکر کی سواد عراق پر لوٹ مار رک گئی، دو عرب سردار قیس کے پاس آئے اس نے انھیں بھی معمول کے مطابق دیا جو انھیں پسند نہیں آیا اور وہ ناراض ہو کر لوٹ گئے، انھوں نے بنو بکر کے لوگوں کو بھڑکا کر سواد عراق پر حملہ کیا اور لوٹ مار مچائی۔

جب اس مکرر حملہ کی خبر کسریٰ پرویز کو پہنچی تو وہ بنو بکر پر بہت غصہ ہوا، اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ نعمان بن المنذر کی اولاد ساز و سامان اور ہتھیار بھی بنو بکر کے پاس محفوظ ہیں تو اس نے قیس ابن مسعود کو لکھا کہ تو نے مجھے اپنی قوم کی طرف سے دھوکے میں رکھا اور اسے ساباط میں قید کر دیا۔

کسریٰ پرویز نے بنو بکر کے سردار ہانی بن مسعود کو لکھا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ نعمان کی اولاد، ساز و سامان اور ہتھیار تمہارے پاس ہیں نعمان ہمارا گورنر تھا لہٰذا سب ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم فوجیں بھیج دیں گے جو تمھیں قتل کریں گی اور تمہاری عورتوں کو گرفتار کر کے باندی بنائیں گی، اس لے

تمہارے لیے اطاعت ہی بہتر ہے''۔

ہانی ابن مسعود نے جواب دیا کہ'' آپ کو غلط خبر دی گئی ہے میرے پاس آپ کو حوالہ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے اور اگر ایسا ہی ہے جیسا کہا گیا ہے تو میں امانت کا حق ادا کروں گا اور اسے ہی لوٹاؤں گا جس نے وہ سونپی ہے''۔

کسریٰ فرات کو عبور کر کے عرب علاقہ میں آیا اور اپنے ماتحت سرداران عرب کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ نعمان بن زرعہ تغلبی نے رائے زنی کی کہ'' اگر بنو بکر کو ذی قار میں گھیر لیا جائے تو وہ ٹڈیوں کی طرح بھن جائیں گے''۔ کسریٰ نے عرب سرداروں نعمان بن زرعہ، خالد بن یزید وغیرہ کے ساتھ اپنے رسالے ''شہبا'' اور ''دوسر'' بھی کر دیے۔ کسریٰ نے حکم دیا کہ بنو بکر کا سامنا ہونے پر نعمان بن زرعہ کو بات چیت کے لیے بھیجا جائے، اگر بنو بکر نعمان کی امانت اور اپنے سو نوجوان بطورِ یرغمال دے دیں تو لڑائی نہ کی جائے ورنہ انھیں زندہ نہ چھوڑا جائے۔

بنو بکر کو خبر ملی تو وہ ذی قار میں جمع ہو گئے، نعمان ابن زرعہ وہاں پہنچا اور اپنے ایک عزیز کے پاس اترا، نعمان نے کہا'' گھر والوں سے جھوٹ نہیں بولا جاتا، تمہارے مقابلہ میں ایرانی سورما اور عرب کے بہادر جمع ہوئے ہیں، ایرانی فوجیں شہبا اور دوسر بھی ساتھ ہیں، جانیں ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ تم امانت حوالہ کر دو اور اپنے سرپھروں کے ظلم و زیادتی کے بدلے میں سو نوجوان یرغمال کے طور پر دے دو''۔ بنو بکر نے کہا ہم غور کریں گے اور قرب و جوار کے لوگوں کو جمع کرنا شروع کر دیا اور ذی قار کی وادی میں محفوظ ہو گئے۔

بنو بکر کے بہت سے سردار جمع ہو گئے، حنظلہ بن ثعلبہ کے سامنے معاملہ پیش کیا گیا کہ نعمان بن زرعہ نے یہ پیام دیا ہے کہ امانت حوالہ کرو سو نوجوان یرغمال کے طور پر دو یا پھر لڑو۔ حنظلہ نے اپنا مشہور خیمہ لگوایا، تمام سرداروں کو ایک جگہ بٹھایا اور سفیر کو بلا کر کہا کہ اگر تم سفیر نہ ہوتے تو ہم تمہیں قرابت داری کے باوجود قتل کر دیتے، جاؤ ہم مقابلہ کریں گے اور تمام سرداروں کو لڑائی کی تیاری کا حکم دیا، بہت سے قرب و جوار کے قبائل مدد کے لیے جمع ہو گئے۔

لڑائی شروع ہونے سے پہلے حنظلہ نے حکم دیا کہ تمام قبیلوں کی پردہ نشین عورتیں پیچھے آ کر کھڑی

ہو جائیں تا کہ کوئی انھیں دشمن کے سامنے چھوڑ کر بھاگ نہ سکے اور نعمان بن منذر کی امانت کو لوگوں میں تقسیم کر دیا اور کہا اگر ہم کامیاب ہو گئے تو سب سامان پھر جمع کر لیں گے اور اگر شکست ہوئی تو دشمن یہ سامان تو بہر حال حاصل نہ کر سکے گا جس کی حفاظت کا ہم نے وعدہ کیا ہے۔

کئی روز تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی بالآخر کسریٰ کے لشکر کو بری طرح ہزیمت اٹھانی پڑی اور عرب اس معرکہ میں کامیاب ہوئے۔ اکثر قبائل کے شعرا نے اپنے اپنے بہادروں کے کارناموں کو نظم کیا ہے اور ذی قار میں ان کی جواں مردی اور بہادری کو سراہا ہے۔

دوسرے اخلاق:

شجاعت کے علاوہ عرب اخلاق میں بادہ نوشی، قمار بازی اور فیاضی کو بطور خاص شمار کیا جا سکتا ہے اور اگر ذرا غور سے دیکھیں تو ہمیں یہ سب خصوصیات حقیقت میں اسی شجاعت اور بے جگری کی شاخیں محسوس ہوں گی۔

عرب کے حالات اور وہاں کے رہنے والوں کے وسائل حیات پر جس کی نگاہ ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ وہاں اپنی ضرورتیں پوری کر لینا ہی کمال ہے نہ کہ دوسروں کی کفالت کی جائے، مگر وہ جو سختیوں کو برداشت کرنے کی ہمت انھیں ودیعت کی گئی ہے وہ ان کو اپنی حالت سے قطع نظر کرتے ہوئے دوسروں کی مدد کرنے پر ابھارتی ہے اور واقعی ایسی حالت میں فیاضی جبکہ خود اپنے پاس کچھ نہ ہو بہت بڑی بہادری کا کام ہے۔

اس سلسلہ میں عرب کے مشہور سخی حاتم کا ایک واقعہ اس کا کافی سے زیادہ ثبوت ہے۔ حاتم کے پاس کچھ مہمان آئے، اس کی سخاوت مشہور تھی اور اسی سلسلہ میں وہ اکثر تنگ دست رہتا تھا، اس زمانہ میں تو اس پر بہت تنگی گذر رہی تھی مگر اس نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا انھیں ٹھہرایا اور باہر نکل کر اپنی سواری کا گھوڑا ان کے لیے ذبح کر ڈالا اور مہمان کی خاطر داری کی۔ صبح کو مہمان رخصت ہونے لگے تو ان میں سے ایک نے حاتم سے اس کا مشہور اور بے مثل گھوڑا دیکھنے کی فرمائش کی، تو حاتم نے جواب دیا ''رات سے پہلے تم نے یہ فرمائش کی ہوتی تو میں وہ گھوڑا تمھیں بخش دیتا مگر اب تو وہ موجود نہیں ہے''۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ حاتم نے مہمانوں کی ضیافت کی خاطر اپنا محبوب گھوڑا ذبح کر دیا ہے تو

وہ بے حد متاثر ہوئے۔

اس ایک مثال کے علاوہ سیکڑوں مثالیں ہیں جن سے عربوں کی فیاضی کا ثبوت ملتا ہے اور یہ خصلت ان میں اتنی عام تھی کہ جز رس یا کنجوس عرب میں بہت ہی مشکل سے مل سکتا تھا۔

قمار بازی اور شراب خواری کو بھی بہادری کی قسم اس لیے گنا جا سکتا ہے کہ ان سے بھی دولت بہت اچھی طرح ضائع ہوتی ہے مگر ان کی قمار بازی میں صرف دولت کو ضائع کرنا ہی نہ تھا ایک طرح یہ مہمان داری کہی جا سکتی ہے۔

جوا عام طور پر ایسے کھیلا جاتا تھا کہ کئی آدمی ایک جگہ جمع ہوئے اور انھوں نے کوئی جانور قرض حاصل کیا اور اسے ذبح کر کے اس کے گوشت کو دس حصوں میں تقسیم کر لیا اس کے بعد جوا کھیلا۔

جوئے کا قاعدہ یہ تھا کہ ایک تھیلے میں چند تیر پڑے رہتے تھے اسے ہلا جلا کر ایک شخص ہاتھ ڈال کر ایک تیر نکالتا، تیروں پر مختلف عدد لکھے ہوئے ہوتے مثلاً ایک تیر ایک حصہ کا ہوتا دوسرا دو حصہ کا، کوئی سات کا اور کوئی دس کا وغیرہ وغیرہ گوشت کے اتنے حصے اس شخص کو دیئے جاتے جس نے تیر نکالا ہوتا دو تین آدمیوں میں یہ دس حصے ختم ہو جاتے، باقی لوگ ہار جاتے اور ہارنے والے جانور کی قیمت ادا کر دیتے، اس طرح ہار جیت ہو جاتی۔ مگر اس کے بعد جیتنے والے ہارنے والوں کو بھی شریک کر لیتے اور سب مل کر اس گوشت سے ضیافت اڑاتے۔

یہی حال شراب خواری کا تھا، وہ شراب خواری کو برا سمجھتے تھے اور اس کے نقصان سے باخبر تھے مگر انھیں اس میں لطف آتا تھا کہ گھر والی ملامت کر رہی ہے، حالات کے اونچ نیچ سمجھا رہی ہے اور وہ اس کے کہنے پر دھیان نہیں دیتے اور جام پر جام چڑھا رہے ہیں، خم پر خم لنڈھا رہے ہیں۔

عرب کے سب سے کم عمر مگر بہت بڑے شاعر نے لذت حیات صرف تین باتوں کو قرار دیا ہے اور وہ کہتا ہے اگر یہ نہ ہوتیں تو مجھے مرنے کا کوئی غم ہی نہ ہوتا۔ ان میں پہلا نمبر وہ مے خواری کو دیتا ہے، دوسرا نمبر بہادری کا ہے اور تیسرے نمبر پر عیش کوشی ہے۔

فلولا ثلاث هن من لذة الفتى وجدک لم احفل متى قام عود

فمنهن سلقى العاذلات بشربة لميت متى ما تغلى بالماء تزبد

وكرمى اذا نادى المضاف محنبا   كسب الغنا نبهته المتورد
وتقصير يوم الدجن والدجن مهلك   ببهكنة تحت الخباء المعمد

ترجمہ:-"اگر یہ تین چیزیں نہ ہوتیں تو میں توجہ بھی نہ کرتا کہ کب میرے عیادت کرنے والے اُٹھ کر چلے گئے، ان میں سے ایک تو ملامت کرنے والیوں کی ملامت گری سے پہلے ہی وہ گہرا سرخ جام چڑھا جانا ہے کہ جب اس میں پانی ملاتو اس میں جھاگ اٹھنے لگیں، دوسرے میرا اپنے گھوڑے محنب کو موڑنا ہے جب کوئی مدد کے لیے پکارے اور وہ گھوڑا بھی کیسا چوکنا ہے، تیسرے بادلوں والے دن کا ایک اونچے اونچے ستونوں والے خیمہ میں ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ اس طرح گذار دینا ہے کہ جیسے دن بہت ہی چھوٹا ہو گیا ہے"۔

عربوں کی خصوصیات میں پاس عہد بھی ایسی خصوصیت تھی جس کی اس زمانہ میں کوئی نظیر نہیں ملتی، کوئی شخص اگر کسی کی پناہ میں آجائے اور حلیف بن جائے تو خواہ وہ دشمن قبیلہ سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتا ہو اس کی حفاظت وہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اگر کوئی اس کے خلاف کر بیٹھے تو اسے بہت ہی بری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

غرضکہ عرب قوم کی خصوصیات پر نگاہ ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ جاہلیت میں بھی اس کے اندر بعض اچھی صفات بھی پائی جاتی تھیں مگر بحیثیت مجموعی قوم سخت انتشار میں مبتلا تھی اور بہادری کے جذبہ نے فخر و ناز کے جذبہ کو ایسا ابھار دیا تھا کہ ان میں ضبط نفس کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا اور تمدن کے لیے سب سے پہلے اسی کی ضرورت ہے کیونکہ نظام اجتماعی اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ہر شخص من مانی کرنے پر مصر نہ ہو۔

حجاز کی حالت:

عرب کا شمالی علاقہ عام طور پر خانہ بدوش عربوں سے آباد تھا، حجاز بھی شمال میں ہی ہے اس لیے وہاں بھی قبیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے اور اس سلسلہ میں دوسرے قبیلوں سے لڑائیاں اور ایک دوسرے پر فخر کرتے رہتے تھے، فخر کے اظہار کے لیے شاعری اچھا ذریعہ ہے اس لیے تقریباً تمام قبائل میں شاعر پائے جاتے تھے۔ اچھے مقرر بھی ہوتے تھے جو دل بڑھاتے تھے۔

اس ادبی ترقی کے باوجود لکھنا عام طور پر کسی کو نہ آتا تھا، قوت حافظہ عربوں میں ایسی تھی کہ تقریروں کے جملے کے جملے اور شاعروں کے قصیدے سن کر انھیں یاد ہو جاتے تھے، اس طرح ایک دوسرے کو سناتے تھے۔

حجاز کے عام باشندوں میں وہ تمام خرابیاں اور خوبیاں تھیں جو عرب کے تمام قبیلوں میں پائی جاتی تھیں، صرف ایک ایسی خصوصیت حجاز کو حاصل تھی کہ اس کی وجہ سے وہ تمام عرب میں ممتاز تھا اور وہ ہے خانۂ کعبہ جسے قوموں کے باپ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی عبادت کے لیے بنایا تھا۔ اگر چہ عربوں نے اسے بھی بت پرستی کا مرکز بنا ڈالا تھا مگر خانۂ کعبہ کا احترام ان کے دلوں میں برابر موجود تھا اور اسی وجہ سے کعبہ کے مجاور قریش کے لوگوں کو سارے عرب میں ایک قسم کی مذہبی سرداری حاصل تھی۔

قریش مکہ اور اس کے قرب و جوار میں آباد تھے، ان میں اجتماعی زندگی کی خوبیاں پائی جاتی تھیں، اگر چہ یہ بھی بت پرستی اور توہمات کا شکار تھے، مگر دوسروں کی طرح خانہ بدوش نہ تھے، یہ لوگ اکثر تجارت پیشہ تھے اور چونکہ خانہ کعبہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے تمام عرب میں ان کی عزت کی جاتی تھی اس لیے یہ آزادی کے ساتھ جاڑے اور گرمی میں اپنے تجارتی قافلے لے کر نکلتے تھے، ایسے ہی ایک تجارتی سفر میں ابو طالب کے ساتھ آنحضرت ﷺ نے سفر فرمایا تھا اور انھیں دیکھ کر ایک عیسائی راہب نے پہچانا تھا اور پیشن گوئی کی تھی کہ یہی وہ نبی موعود ہیں جن کی بشارت آسمانی کتابوں میں موجود ہے اور یہی نبی آخر زماں ہوں گے۔

قریش میں سب سے محترم بنو ہاشم سمجھے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ اسی گھرانے میں پیدا ہوئے، پیدائش سے پہلے ہی حضور کے والد کا انتقال ہو چکا تھا رواج کے مطابق آپ کو بنو سعد میں حضرت حلیمہ نے پرورش کیا چھ سال کی عمر میں مکہ واپس تشریف لے آئے، اسی کے بعد حضور کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضور کی پرورش حضرت عبدا ❋ نے کی مگران کا بھی جلد ہی انتقال ہو گیا تو ابو طالب نے آپ کو اپنے بچوں کی طرح پرورش کیا۔ اگر چہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد ابو طالب نے ایمان کا اعلان نہیں کیا مگر آخر دم تک وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتے رہے اور

مخالفوں کے مقابلہ میں سینہ سپر رہے۔

بعثت رسول ﷺ:

آنحضرت ﷺ اسی مشرکانہ اور گمراہ ماحول میں رہ کر بھی ان تمام برائیوں سے دور رہے جو اس زمانہ میں عام تھیں بلکہ انھیں مایۂ ناز فخر سمجھا جاتا تھا، اسی کا اثر تھا کہ قبل بعثت کفار قریش آنحضرت کو صادق اور امین کے لقب سے یاد کرتے تھے اور اسی امانت داری کو دیکھتے ہوئے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے خود ہی آنحضرت ﷺ سے نکاح کی درخواست کی تھی۔

بعثت سے قریب آنحضرت ﷺ اکثر شہر سے دور پہاڑ کے غار میں تشریف لے جاتے اور ریاضت فرماتے تھے۔ اسی زمانہ میں پہلے آپ کو رویائے صادقہ نظر آنے لگے تھے جو رات کو خواب میں دیکھتے بالکل وہی واقعہ پیش آتا۔ اس کے بعد اللہ کا فرشتہ ظاہر ہوا اور اس نے اللہ کا حکم سنایا۔

آنحضرت ﷺ نے گھر تشریف لا کر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے ذکر فرمایا کہ "کچھ ایسے واقعات پیش آرہے ہیں کہ مجھے جان کا ڈر محسوس ہوتا ہے" انھوں نے کہا "آپ صادق اور امین ہیں، اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا" اور پھر اپنے رشتہ کے بھائی کے پاس لے گئیں جو کتابوں کا علم رکھتے تھے اور بڑے کاہن تھے، جب انھوں نے واقعہ سنا تو کہا "یہ ناموس اکبر ہے، یہی فرشتہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا" اس کے بعد انہوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور کہا "کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی، میں آپ کی مدد کرتا"۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا "کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟" تو انھوں نے کہا "جو بھی وہ لے کر آیا ہے جو تمھیں دیا گیا ہے اس کی قوم نے ہمیشہ مخالفت کی ہے مگر کامیابی تمہیں ہی حاصل ہوگی"۔

تبلیغ اور اس کا اثر:

بعثت کے بعد جب آنحضرت ﷺ کو تبلیغ دین کا حکم ملا اور آپ نے خدا کا حکم بندوں کو پہنچایا تو ابتدا میں اپنے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کو بتایا اور وہ فوراً ایمان لے آئے۔ یہ بھی آپ کی رسالت کا ایک بین ثبوت ہے کیونکہ اگر آپ میں (معاذ اللہ) جھوٹ بولنے کی صفت ہوتی تو اس سے دوسرے نہ سہی قریبی لوگ ضرور باخبر ہوتے اور جب آپ ایک بالکل انوکھی بات ان کو سناتے تو وہ

ضرور اس سے انکار کر دیتے۔

قریب کے لوگوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد تبلیغ کا دوسرا مرحلہ ہدایت عام شروع ہوا اس کے ساتھ ہی دشمنیوں کا طوفان جوش میں آ گیا اور لطف یہ ہے کہ وہی جو صادق اور امین کہتے تھے اب جھٹلانے لگے اور ہر طرح اس دین کے پھیلنے کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وحدانیت کا عقیدہ انسانی زندگی سے ان امتیازات کو میٹ دیتا ہے جو عرب قوم کا سرمایۂ ناز و افتخار تھے، وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے غلام بھی اسلام قبول کرنے کے بعد ویسے ہی اللہ کے بندے شمار ہوں جیسے وہ شمار کیے جائیں گے اور پھر اسلام تو عرب و عجم سیاہ و سفید، غنی و مفلس کسی فرق کو تسلیم نہیں کرتا اس لیے دانایان قریش کو فکر ہوئی کہ اس ندائے حق کو خاموش کیا جائے۔

قریش نے ابو طالب سے شکایت کی جو قوم کے بزرگ اور آنحضرت کے سگے چچا تھے کہ ''تمہارا بھتیجا نئی نئی باتیں کہتا ہے اسے اس سے باز رکھو، اگر وہ اس کے ذریعہ سے مال و دولت چاہتا ہے تو ہمیں بتاؤ ہم اتنا مال جمع کر دیں گے کہ اس کے برابر کوئی دولت مند نہ ہوگا، اگر وہ کسی حسین عورت سے شادی چاہتا ہے تو اس کے لیے ہر حسین لڑکی فراہم کی جائے گی اور اگر وہ بادشاہی کا خواہاں ہے تو ہم اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے، مگر اسے یہ نئے دین کی باتیں چھوڑنی ہوں گی''۔

ابو طالب نے آنحضرت ﷺ سے تذکرہ کیا اور کہا ''پوری قوم خلاف ہے، پھر بھی وہ تمہیں راضی کرنا چاہتی ہے لیکن اگر تم نے نہ مانا تو دشمنی پر آمادہ ہو جائے گی، مجھ بوڑھے پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میں اٹھا نہ سکوں''۔ آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ ''آپ خوشی سے علیحدہ ہو جایئے اگر یہ لوگ میرے ہاتھوں میں چاند اور سورج بھی لا کر رکھ دیں تب بھی میں یہی کہوں گا کہ خدا ایک ہے اور میں اس کا بندہ ہوں اور رسول ہوں''۔ اس جواب سے ابو طالب کو سچ کی طاقت کا اندازہ ہوا اور انھوں نے کہا جو تمہارا جی چاہے کرو، میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔

کفار قریش کا سلوک:

کفار قریش نے مسلمانوں کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچانے کے علاوہ ایک معاہدہ پر تمام سرداروں کے دستخط کرائے کہ بنو ہاشم نے چونکہ آنحضرت ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے اس لیے ان

سے ہر قسم کے تعلقات توڑے جاتے ہیں۔ حفاظت کے خیال سے آنحضرت ﷺ اور خاندان بنو ہاشم ایک گھاٹی میں منتقل ہوگیا، جسے شعب ابوطالب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ دور بے انتہا معاشی تکالیف کا دور ہے مگر مسلمان ثابت قدم رہے، حج کے زمانہ میں جب کشت وخون عام طور پر بند ہوتا ہے، آنحضرت ﷺ لوگوں سے مل کر انھیں اسلام کی طرف بلاتے تھے، اس طرح آہستہ آہستہ اسلام کے نام لیوا عرب کے مختلف علاقوں میں پھیلتے جاتے تھے۔

آغاز اسلام میں عام طور پر مسلمان کمزور اور غریب تھے، اس لیے کفار نے ان کے خلاف طاقت اور لالچ دونوں حربے استعمال کیے، ایسی کوئی اذیت نہ تھی جو کمزور مسلمانوں کو نہ دی جاتی ہوں، غلام تو خیر ہر قسم کے جبر وتشدد کا شکار تھے ہی مگر قریش بھی کفار کے مظالم سے محفوظ نہ تھے۔ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تحریک پر اسلام قبول کرلیا اور ان کے عزیزوں کو معلوم ہوا تو وہ بھی قریش ہونے کے باوجود تکالیف سے محفوظ نہ رہے، ان کے چچا انھیں بورے میں لپیٹ دیتے تھے اور پھر اس میں مرچوں کی دھونی دیتے تھے۔ سیدنا عثمان کا دم گھٹ گھٹ جاتا تھا مگر پائے ثبات کو کسی قسم کی لغزش نہ ہوتی۔

حضرت سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ غلام تھے، غلاموں کے ساتھ ویسے ہی سختی کی جاتی تھی اب جو یہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تو اُن کے مالک نے ایسی ایسی تکلیفیں دیں کہ ان کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ان کی پیٹھ برہنہ کر کے تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جاتا اور اوپر پتھر کی سل رکھ دی جاتی تاکہ کروٹ بھی نہ بدل سکیں، مگر غشی میں بھی ان کی زبان سے ''احدٌ احدٌ'' ہی نکلتا تھا۔

ظلم وتشدد اور مال ودولت کا لالچ کچھ بھی عقیدۂ توحید کے پرستاروں پر اثر انداز نہ ہوا۔

ہجرت کی اجازت:

آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ مسلمانوں پر دامن حیات تنگ ہے تو انھیں اجازت عطا فرمائی کہ وہ ہجرت کر کے حبشہ چلے جائیں۔ حبشہ کی طرف ہجرت کا خیال اس لیے پیدا ہوا کہ وہاں کا فرماں روا نجاشی عیسائی تھا۔ یہ سمجھا گیا کہ مشرکین کے مقابلہ میں دوسرے اہل کتاب کا طرزِ عمل مسلمانوں کے ساتھ اچھا ہوگا۔ چنانچہ مسلمانوں کی دو جماعتیں یکے بعد دیگرے حبشہ کو ہجرت کر گئیں۔ کفار قریش

کو جب یہ محسوس ہوا کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے جا رہے ہیں تو انھیں ایک طرف تو یہ تشویش ہوئی کہ کہیں یہ لوگ وہاں پہنچ کر شاہ حبشہ کی مدد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ اس کے تدارک کے لیے انھوں نے اپنی سفارت حبشہ روانہ کی کہ بادشاہ سے مل کر مسلمان مہاجرین کو گرفتار کر کے مکہ واپس لائیں۔ دوسری طرف انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی تعداد مکہ میں اور بھی کم ہو گئی ہے تو باقی لوگوں پر اور بھی سختی کرنے لگے۔

دربار نجاشی میں:

مسلمانوں کو گرفتار کر کے مکہ واپس لانے کے لیے جو سفارت حبشہ بھیجی گئی اس کے ساتھ بادشاہ کے لیے تحفے دیے گئے، اس جماعت نے بادشاہ کے مصاحبوں کو ملا لیا اور پھر بادشاہ سے درخواست کی کہ ہمارے کچھ غلام اور عزیز گمراہ ہو کر یہاں بھاگ آئے ہیں۔ انھیں ہمارے حوالہ کر دیا جائے تا کہ ہم انھیں واپس لے جا کر ان کے ساتھ انصاف کریں۔ بادشاہ نے بھاگنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ ہم میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو خود کو نبی کہتا ہے اور ہمارے مذہب کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا ہے اس سے یہ لوگ مل گئے ہیں اور یہاں بھاگ آئے ہیں۔

بادشاہ نے نبی علیہ السلام کے متعلق سوالات کیے ''ان کا تعلق تمہارے کس خاندان سے ہے؟'' کافروں نے تصدیق کی کہ وہ عرب کے سب سے شریف اور معزز خاندان سے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا ''نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے اس شخص کا کیا حال تھا؟'' سب نے تصدیق کی کہ وہ نہایت شریف اور ہمدرد انسان تھا ہم اسے امین اور صادق کے لقب سے یاد کرتے تھے، مگر نہ معلوم اس کے دل میں کیا آیا کہ اس نے ساری قوم کو اپنا دشمن بنا لیا اور نئی نئی باتیں کرنے لگا۔ ان جوابات سے بادشاہ پر آنحضرت ﷺ کی صداقت ظاہر ہو گئی اور اس نے کہا ''وہ ضرور وہی نبی ہیں جن کا آخر زمانہ میں ظہور ہونا آسمانی کتابوں میں لکھا ہے، میں ان کے پیروؤں کو جو اپنی جان بچا کر یہاں آئے ہیں تمہارے حوالے نہیں کر سکتا کہ تم ان پر ظلم کرو''۔

سفارت ناکام ہو گئی تو انھوں نے ایک اور چال چلی کہ عیسائی پادریوں کو بلا لیا اور بادشاہ سے شکایت کی کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی خدا کا بیٹا نہیں مانتے۔ بادشاہ نے دربار کیا اور مسلمان مہاجرین کو

اس میں طلب کیا۔

مہاجرین کی طرف سے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ گفتگو کرنے کے لیے نمائندہ منتخب ہوئے۔ بادشاہ نے ان سے پہلے تو ان کے اور قریشی کفار کے اختلاف کی وجہ پوچھی، انھوں نے نہایت فصاحت سے تقریر کی کہ ''اے بادشاہ تجھے معلوم ہے کہ ہم عرب قوم ایک زمانہ سے ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے، ہر وقت ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے اور ساری دنیا میں ہمیں سب سے خراب سمجھا جاتا تھا، ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جو ہم میں سب سے معزز اور شریف گھرانے کا فرد ہے، اس کی زندگی شرافت اور سچائی کی زندگی ہے، کفار بھی اسے امین اور صادق کہتے تھے، پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا اور اس نے ہمیں بتایا کہ اللہ ایک ہی ہے، ہمیں اس کے علاوہ اور کسی کے سامنے جھکنا نہ چاہیے، ہم میں جتنی خرابیاں تھیں وہ سب اس نے دور کر دیں، ہمارا قصور صرف اتنا ہی ہے کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اسی پر یہ کفار ہم سے ناراض ہیں اور ہمیں مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں''۔

پھر اس نے پوچھا ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے؟'' اس پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے کہا ''ہمارے رسول پر جو اللہ کی وحی نازل ہوئی ہے اس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندہ اور رسول تھے جن کو اللہ نے اپنی قدرت سے بغیر باپ کے پیدا کیا، وہ اللہ کی نشانی ہیں اور ان کی ماں پاک دامن ہیں''۔ سورۂ مریم کی آیتیں سن کر حبشہ کے بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے کہا ''جو تم نے بیان کیا یہی بالکل سچ ہے اور اطمینان دلایا کہ تم پر کوئی ظلم نہیں کر سکے گا، آزادی سے رہو'' اور قریشی سفارت کو ان کے تحفے واپس کر دیئے اور وہ ناکام واپس ہوئی۔

ہجرت رسول:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ان قافلوں میں جا کر اسلام کا پیام پہنچاتے تھے جو مکہ حج کے سلسلہ میں آیا جایا کرتے تھے، اس سلسلہ میں مدینہ کے دو قافلہ آ چکے تھے اور اسلام قبول کر کے واپس ہوئے تھے اور اپنے ساتھ ایک صحابی رسول کو بھی لے گئے تھے کہ وہ وہاں لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیں، مدینہ کے

ان لوگوں کا اصرار تھا کہ آنحضرت ﷺ بھی مدینہ تشریف لے چلیں اور انھوں نے ہر قسم کی مدد کرنے کا عہد بھی کر لیا تھا، مگر جب تک اللہ کا حکم اس کے رسول کو نہ ہو وہ ہجرت نہیں فرما سکتا، اسی لیے آنحضرت ﷺ مکہ میں قیام پذیر تھے۔

طائف مکہ سے قریب ایک شہر ہے، سرکار وہاں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے گئے کیونکہ مکہ والے تو بات سنتے ہی نہ تھے، امید تھی کہ یہ لوگ ہی سیدھے راستہ پر آجائیں گے مگر انھوں نے بہت ہی تکلیف پہنچائی، بچوں نے پتھر برسائے اور ایذا دی۔ آنحضرت ﷺ دل شکستہ مکہ تشریف لائے تو اللہ کی طرف سے اذن ہجرت ملا۔

آنحضرت ﷺ نے یہ مژدہ اپنے سب سے پہلے جاں نثار اور رفیق سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو سنایا اور انھیں ہم رکابی کا شرف بخشا گیا۔

کفار اس تاک میں تھے کہ اب رسول کے فدائی بہت ہی کم رہ گئے ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انھیں قتل کر دیا جائے تو اچھا ہے، چنانچہ مختلف سردار اس ارادہ سے مکان کے دروازہ پر پہنچ گئے کہ جس وقت سرکار برآمد ہوں گے یہ سب ایک دم حملہ کر کے انھیں قتل کر دیں گے۔

آنحضرت ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر قریش کی وہ امانتیں ان کے سپرد کیں جو اب بھی سرکار کے پاس تھیں اور کہا تم صبح یہ لوٹا دینا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بستر پر لیٹ گئے اور سرکار سورۂ یٰسین کی آیتیں تلاوت کرتے ہوئے دروازہ سے برآمد ہوئے۔ کفار پر ایسی غفلت چھا گئی کہ وہ دیکھ ہی نہ سکے اور سرکار ان کے درمیان سے ہو کر گذر گئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا اور مکہ سے باہر ایک غار میں تین دن قیام کرنے کے بعد مدینہ کی طرف تشریف لے گئے۔

کفار نے گرفتاری کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے اور سرکار بخیریت مدینہ پہنچے۔ مدینہ کے رہنے والوں نے عقیدت کے پھول نچھاور کیے اور شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔

سرکار نے کچھ دن کے لیے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام فرمایا اور جب مسجد اور اپنے قیام کے لیے مکانات تعمیر کر لیے تو پھر وہاں منتقل ہو گئے۔

دار الامن:

آنحضرت ﷺ کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد مسلمانوں کو دارالامن میسر آ گیا اور ہر طرف سے مسلمان مدینہ کی طرف ہجرت کرنے لگے، حبشہ ہجرت کر جانے والے بھی مدینہ آ گئے۔ مکہ سے ہجرت کر کے آنا بہت ہی مشکل تھا، جو لوگ رہ گئے تھے ان پر بہت کڑی نگرانی تھی۔ صرف سیدنا فاروق اعظم ایک ایسی شخصیت ہیں جس نے اعلان کے بعد ہجرت کی، وہ گھر سے مختصر سامان لے کر تلوار، تیر کمان لے کر نکلے، خانہ کعبہ میں آ کے سات مرتبہ طواف وداع کیا اور پھر ادھر ادھر کفار قریش کی جوٹولیاں بیٹھی ہوئی تھیں ان میں سے ہر ایک کے پاس جا کر کہا ''میں ہجرت کر کے جا رہا ہوں جسے اپنی بیوی کو بیوہ کرنا اور بچوں کو یتیم کرنا ہو وہ مجھ سے وادی حرام کے باہر آ کے مل لے''۔ اس اعلان کے بعد بھی کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ انھیں ٹوک سکے۔

دارالامن پا کر جان کا خوف تو جاتا رہا مگر معاشی تنگی اور بھی زیادہ محسوس کی جانے لگی کیونکہ اکثر مہاجر صرف جانیں بچا کر مدینہ آ گئے تھے، مال و دولت اور مکان وغیرہ سب چھوڑنا پڑا تھا، اگر فوری طور پر اس کا انتظام نہ کیا جاتا تو مسلمان شدید تکلیف میں مبتلا ہو جاتے۔

آنحضرت ﷺ نے بھائی چارگی کا ایک قاعدہ بنایا جسے ''عقد مواخات'' کہتے ہیں۔ مدینہ میں رہنے والے انصاری اور باہر سے آنے والے مہاجرین میں یہ رشتہ قائم ہو گیا۔ ایک ایک انصاری نے اپنے اپنے مہاجر بھائی کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس طرح وہ بوجھ بٹ گیا جو اتنے مہاجرین کے بے سرو سامان مدینہ آنے کی وجہ سے معاشرہ پر تھا۔

انصار نے نہایت اولوالعزمی سے مہاجرین کی خاطر داری کی، اپنا برابر کا حصہ دار بنا لیا، گھر، کاروبار سب میں ہی حصہ دیا اور مہاجرین بھی کاروبار میں لگ کر آمدنی میں اضافہ کرنے لگے۔

جنگ کی اجازت:

عقد مواخات اور مہاجرین کے کاروبار میں لگ جانے سے وہ پریشانی ایک حد تک کم ہو گئی تھی جو بے سروسامان مہاجرین کے مدینہ کی طرف ہجرت سے پیدا ہوئی تھی مگر مسلمانوں کا آنا برابر جاری تھا۔ دوسری طرف کفار قریش مسلمانوں کو تنگ کر کے مکہ سے نکال دینے پر ہی مطمئن نہیں تھے، وہ تیاری کر رہے تھے کہ مدینہ میں مسلمانوں کو جو دارالامن مل گیا ہے اس سے بھی انھیں محروم کر دیا جائے۔ چنانچہ

انھوں نے مدینہ کے رہنے والوں سے خفیہ طور پر نامۂ و پیام کیے اور یہودیوں کو بھڑکایا اور دوسری طرف وہ خود مدینہ پر چڑھائی کا منصوبہ بنانے لگے۔ انھوں نے ابوسفیان کی نگرانی میں شام کی طرف ایک بڑا تجارتی قافلہ روانہ کیا اور طے کیا کہ اس کے منافع سے مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاری کی جائے گی۔

مسلمانوں کو کفار کے ناپاک عزائم کا علم ہوا تو انھوں نے پہلے تو مدینہ کے یہودیوں سے باز پُرس کی کہ تم نے کفار قریش کی مدد کا ارادہ کیا تو پھر ہمارے اور تمہارے درمیان جو صلح کا معاہدہ ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ دوسری طرف یہ طے کیا گیا کہ قریش پر اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیے ان کے تجارتی راستہ کو روکا جائے تاکہ وہ محسوس کریں کہ اگر انھوں نے مسلمانوں سے دشمنی ختم نہ کی تو ان کے کاروبار کو شدید نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ قافلہ کا راستہ روکنے کے لیے مسلمانوں کی مختصر سی جماعت جو پوری طور پر مسلح بھی نہ تھی مدینہ سے نکلی، قافلہ تجارت کے سالار ابوسفیان کو معلوم ہوا کہ مسلمان اسے راستہ میں روکیں گے تو اس نے اپنا راستہ بدل دیا اور ایک تیز رو قاصد مکہ روانہ کیا کہ وہ وہاں یہ خبر سنائے کہ مسلمانوں نے تمہارا قافلۂ تجارت لوٹ لیا ہے تاکہ قریشی سورما ان مٹھی بھر مسلمانوں کو قریشیوں کے راستہ روکنے کا مزا چکھادیں۔

مسلمانوں کو پتہ چلا کہ قافلہ جس کے روکنے کے لیے وہ آئے تھے وہ تو دوسرے راستہ سے نکل چکا ہے مگر کفار قریش کا جرار لشکر بڑھا آتا ہے، جس کی تعداد مسلمانوں سے تگنی سے بھی زیادہ ہے اور ہر شخص مسلح ہے مگر مسلمان باہر نکل چکے تھے، بغیر مقابلہ واپس جانا مناسب معلوم نہ ہوا چنانچہ بدر کے مقام پر مسلمان رک کر کفار کی پیش قدمی کا انتظار کرنے لگے۔

غزوۂ بدر:

اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں ایسی لڑائیاں جن میں خود آنحضرت ﷺ نے شرکت فرمائی ہو ''غزوہ'' کہلاتی ہیں۔ غزوہ بدر اسلام کی پہلی صف آرائی ہے اور اپنے دوررس نتائج کے لحاظ سے بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) بتائی جاتی ہے، بعض لوگ تین سو ساٹھ

(۳۶۰) بتاتے ہیں جن میں بوڑھے جوان اور بچے سب ہی شامل ہیں، ممکن ہے تعداد کے متعلق اس اختلاف روایت کی وجہ یہ ہو کہ مدینہ سے روانگی کے وقت بہت سے کم عمر مسلمان بھی شوق جہاد میں ساتھ ہو لیے تھے، بعد میں آنحضرت ﷺ نے سب کا جائزہ لیا اور جو بہت کم عمر تھے انھیں دعا دے کر واپس جانے کی ہدایت فرمائی۔ پھر بھی کم سے کم دو بچوں نے ضرور لڑائی میں شرکت کی اور قریش کے سردار ابو جہل کو قتل کرنے میں کامیاب ہوئے اور ان تین سو تیرہ کے مقابلہ میں کفار قریش کا لشکر ایک ہزار جنگ آزماؤں پر مشتمل تھا۔

لڑائی کے میدان کے قریب مسلمانوں نے ایک عرش (سائبان/ چھپر) تیار کر دیا جہاں آنحضرت ﷺ تشریف رکھیں اور لڑنے والوں کو ہدایات دیں۔

آنحضرت نے مسلمان مجاہدوں کی صف بندی کی اور احکام دیئے کہ ''اس وقت تک حملہ کی ابتدا نہ کریں جب تک دشمن خود لڑائی نہ چھیڑے اور جب دشمن ہتھیار ڈال دے اس کے بعد تم بھی ہاتھ روک لو اور کسی کو قتل نہ کرو''۔ مسلمانوں کی ہمت بندھانے کے لیے آنحضرت نے بڑے بڑے سرداران قریش کے مارے جانے کی پیشن گوئی فرما دی اور وہ جگہ بھی بتا دی کہ یہاں پر فلاں شخص مرے گا۔

جہاد کی فضیلت بیان کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جو ثابت قدمی سے لڑے اور سینہ پر زخم کھا کر شہید ہو وہ بغیر حساب کتاب جنت میں داخل کیا جائے گا اور اس کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے''۔ جس وقت آنحضرت یہ تقریر فرما رہے تھے ایک صحابی رسول کے ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں جنھیں وہ کھا رہے تھے۔ انھوں نے کہا ''خدا کی قسم میرے اور جنت کے درمیان یہ چند کھجوریں ہیں''، کھجوریں ختم کر کے انھوں نے دشمن پر شدید حملہ کیا اور راہ حق میں شہادت کا اعزاز پایا۔

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی فتح اور نصرتِ الٰہی کے لیے میدانِ بدر میں جو دعا کی وہ بھی اپنی جگہ بہت خاص ہے۔ آنحضرت نے فرمایا ''اے اللہ یہ تیرے تھوڑے سے بندے تیری راہ میں لڑنے نکلے ہیں تو ان کی اپنی غیبی طاقت سے مدد فرمانا''۔ پھر ناز محبوبیت سے عرض کیا ''باریالٰہ اگر یہ جماعت کام آ گئی تو پھر صفحہ ہستی پر تیری عبادت کبھی بھی نہ ہو سکے گی''۔ اس دعا کو سن کر حضرت صدیق

اکبر کو فوراً محسوس ہو گیا کہ فتح یقینا مسلمانوں کو حاصل ہو گی۔

لڑائی کی ابتدا عرب کے پرانے قاعدہ کے طور پر ''مبارز طلبی'' کے طویقہ پر ہوئی۔ کفار قریش کی طرف سے تین بہادر سردار میدان میں آئے اور اپنا مقابل طلب کیا، مسلمانوں کی طرف سے تین انصاری لڑنے کے لیے نکلے، انھوں نے پوچھا تم کون ہو؟ انھوں نے اپنا حسب نسب بتایا تو انھوں نے لڑنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم ہمارے برابر کے نہیں ہو، ہم تمہارے خون سے اپنی تلوار کو گندہ نہیں کریں گے اور آنحضرت ﷺ کو آواز دے کر کہا ''ہمارے مقابلہ کے لیے ہماری برابر کا کوئی بھیجو''۔ آنحضرت ﷺ نے سیدنا حمزہ بن عبدا ❋، سیدنا علی بن ابی طالب اور سیدنا ابوعبیدہ کو بھیجا جو تینوں قریشی اور ہاشمی تھے، انھیں دیکھ کر قریشی سرداروں نے کہا اب ہمیں لڑنے میں مزہ آئے گا اور لڑائی شروع ہوئی۔ سیدنا حمزہ اور سیدنا علی نے اپنے اپنے مقابل کو فوراً قتل کر دیا، البتہ سیدنا ابوعبیدہ زخمی ہو گئے تو ان کی مدد کے لیے یہ دونوں چچا بھتیجے پہنچ گئے اور ان کے مقابل کو بھی قتل کر دیا۔

ابوجہل نے یہ دیکھا تو وہ چیخا ''اس طرح ایک ایک آدمی لڑتا رہا تو یہ سب کو اسی طرح کاٹ ڈالیں گے، سب مشترک ہجوم کر دو اور ان مٹھی بھر لوگوں کو پیس ڈالو''۔ عام لڑائی میں بے سروسامانی کے باوجود مسلمانوں نے کفار قریش کی اس زبردست فوج کو ایسی زبردست شکست دی کہ وہ ستر بہادروں کی لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگے اور اتنے ہی آدمی زندہ گرفتار کر لیے گئے۔

قیدیوں کے ساتھ سلوک:

مدینہ کے یہودیوں وغیرہ کو یقین تھا کہ بدر کے معرکہ میں مسلمانوں کو شکست ہو گی مگر جب مسلمان فتح و کامرانی کے بعد ستر جنگی قیدیوں کو لے کر مدینہ پہنچے تو سب پر دہشت طاری ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ نے قیدیوں کو آرام سے رکھنے کی ہدایت دی اور پھر صبح میں ان کے متعلق مشاورت فرمائی۔ بعض رائیں قیدیوں کو قتل کر دینے کی تائید میں تھیں کیونکہ ان میں سے اکثر نے اسلام کو شدید نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی، مگر آنحضرت ﷺ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا کہ قیدیوں سے زرِ فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے جس سے مسلمانوں کی مالی حالت درست ہو گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں ان میں سے کسی کو اسلام قبول کر لینے کا موقع ہی میسر آ

جائے۔ چنانچہ سرکار رسالت ﷺ نے حکم دے دیا کہ فدیہ کی رقم ادا کر کے ہر قیدی آزادی حاصل کر لے اور جس کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لیے دولت نہ ہو مگر وہ لکھنا پڑھنا جانتا ہو تو وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے یہی اس کا فدیہ سمجھا جائے اور جو یہ بھی نہ کر سکے اسے ویسے ہی آزاد کر دیا جائے۔

اس طرح اس حسن سلوک نے بہت سوں کو اسلام کی طرف راغب کر دیا اور بعد میں وہ مشرف بہ اسلام ہو کر حق کی خدمت میں سرگرم ہوئے۔

غزوۂ بدر کا اثر:

غزوۂ بدر مسلمانوں کی پہلی لڑائی تھی اس لیے بہت اہمیت رکھتی ہے، اس فتح نے مسلمانوں کے حوصلے بلند کر دیئے، خدا کی مدد پر ان کا ایمان اور مضبوط ہو گیا اس کے علاوہ مسلمانوں کی معاشی حالت اور سیاسی اثر پر بھی اس کا بہت اچھا اثر پڑا، قیدیوں سے فدیہ کی رقم ملی اور دوسرے عرب قبیلوں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس اعتبار سے یہ لڑائی مسلمانوں کے لیے ہر طرح مفید رہی۔ اسی کے ساتھ مسلسل لڑائیوں کا ایک سلسلہ بھی شروع ہو گیا کیونکہ عرب قوم ہمیشہ سے انتقام لینے اور لڑنے مرنے کی عادی تھی۔ بدر کے میدان میں جو قریش کے سردار مارے گئے اس سے ان کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور انھوں نے عہد کر لیا کہ وہ اس لڑائی کا بدلہ مسلمانوں سے ضرور لیں گے اور انھیں مٹا کے دم لیں گے۔ اگر چہ وہ اپنے اس ارادہ میں تو کامیاب نہ ہو سکے کہ مسلمانوں کو فنا کر دیں مگر جب تک ان کا بس چلا وہ برابر لڑائی کرتے رہے۔ اس طرح بدر کی لڑائی گویا مسلمانوں کی جنگی زندگی کی ابتدا بھی ثابت ہوئی۔

غزوۂ سویق:

بدر کی شکست کے بعد قریش میں ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا اور اپنے سرداروں کے ماتم میں انھیں اپنی زندگی بے کار نظر آتی تھی۔ ابوسفیان نے قسم کھائی کہ وہ اس کا بدلہ ضرور لے گا اور چپکے سے کچھ ساتھیوں کو لے کر مدینہ کے باہر کے باغوں پر حملہ کیا، کچھ جانور چرانے والے مار ڈالے اور مویشی لے کر فرار ہو گیا۔

مسلمانوں کو جس وقت اس غارت گری کی خبر ملی انھوں نے فوراً ان کا تعاقب کیا مگر وہ بہت

تیزی سے بھاگے تھے اس لیے پکڑے نہ جا سکے۔ البتہ ستو کے تھیلے راستہ میں پڑے ہوئے ملے جو دشمن نے اپنے توشہ کے طور پر ساتھ رکھے تھے مگر انھیں اس لیے پھینک دیا کہ اس کے بوجھ کی وجہ سے اونٹ زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتے تھے اور خطرہ تھا کہ مسلمان ان کا تعاقب کر کے انھیں پکڑ لیں گے۔

''سویق'' ستو کو کہتے ہیں، اس حملہ میں دشمن ستو کے تھیلے پھینک کر بھاگا تھا اس لیے اس واقعہ کا نام غزوۂ سویق ہی ہو گیا، مگر اس میں کوئی باضابطہ لڑائی نہیں ہوئی دشمن نے دھوکے سے کچھ لوٹ مار کی اور بھاگ گیا۔

غزوۂ احد:

بدر کا انتقام لینے کے لیے مکمل تیاری کے ساتھ کفار قریش نے مدینہ کی طرف اپنی فوجیں بڑھائیں۔ جب آنحضرت ﷺ کو ان کے حملہ کا علم ہوا تو آپ نے مسلمانوں سے مشاورت فرمائی۔ سن رسیدہ مسلمانوں کا خیال تھا کہ مدینہ میں کفار کے لشکر کا انتظار کرنا چاہیے مگر جوشیلے نوجوانوں کو یہ بزدلی معلوم ہوئی اور ان کی رائے ہوئی کہ باہر نکل کر دشمن کو روکا جائے۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتی رائے بھی انتظار کرنے کی تھی مگر کثرت اسی خیال کی تائید میں تھی کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ اس لیے اسی رائے کو قبول کر لیا گیا اور مسلمانوں کا لشکر مدینہ سے باہر نکلا، منافقوں کی ایک بڑی جماعت نے راستہ میں ہی ساتھ چھوڑ دیا اور یہ کہہ کر مدینہ واپس آ گئی کہ چونکہ ہماری رائے نہیں مانی گئی اس لیے ہم اس لڑائی میں شرکت نہیں کریں گے۔

جبل اُحد کے پاس مسلمانوں نے قیام کیا، آنحضرت ﷺ نے لڑائی کے میدان کا معائنہ کرنے کے بعد ایک پہاڑی درے کے پاس کچھ تیر اندازوں کو مقرر کر دیا اور انھیں حکم دیا کہ ''خواہ فتح ہو خواہ شکست تم لوگ برابر اس درہ کی نگرانی کرتے رہو، یہاں سے کسی حالت میں تمھیں ہٹنا نہ چاہیے''۔

کفار جوش انتقام میں پوری تیاری سے آئے تھے، اس لڑائی میں سرداری ابوسفیان کو ملی تھی، انھوں نے زبردست حملہ کیا مگر مسلمان بہادروں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے،

مسلمانوں نے بھاگنے والوں کا تعاقب کیا اور بہت سو کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ محسوس کرنے کے بعد کہ کفار بھاگ گئے ہیں اور مسلمانوں کو کامل فتح حاصل ہوگئی ہے ان تیر اندازوں کو اپنا اس درہ پر کھڑے رہنا بے کار معلوم ہوا جہاں انھیں آنحضرت ﷺ نے مقرر کردیا تھا اور وہ بھی مالِ غنیمت کے شوق میں حملہ آوروں میں شریک ہوگئے، اسی ایک عدول حکمی سے لڑائی کا رنگ بدل گیا۔

خالد بن ولید اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور کفار کے ایک رسالہ کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی، انھوں نے فوراً محسوس کرلیا کہ اس درہ سے گذر کر مسلمانوں کے پیچھے پہنچا جاسکتا ہے چنانچہ فوراً وہ اپنے سواروں کو لے کر ادھر پہنچ گئے اور مسلمانوں پر پیچھے سے بھی حملہ کردیا، اس اچانک حملہ سے مسلمانوں میں پراگندگی پیدا ہوگئی جس کے نتیجہ میں ستر مسلمان بہادر شہید ہوئے جن میں سیدنا حمزہ بھی تھے۔خود آنحضرت ﷺ پر حملہ کیا گیا اور ایک پتھر لگنے سے حضور ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوگئے۔

کسی نے یہ خبر اُڑادی کہ آنحضرت ﷺ شہید ہوگئے ہیں، اس سے بہت سے مسلمان ہوش و حواس کھو بیٹھے مگر جس وقت یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ بخیریت ہیں تو پھر مسلمانوں میں جان آگئی اور وہ حضور علیہ السلام کے قریب جمع ہوگئے اور جم کر لڑے۔

ابوسفیان نے محسوس کیا کہ وقتی طور پر جو فتح حاصل ہوگئی تھی وہ شکست میں تبدیل ہوجائے گی تو لڑائی کو طول دیئے بغیر واپس جانے کا اعلان کردیا۔اس طرح یہ لڑائی ختم ہوئی اور صرف ایک معمولی سی غلطی کی بنا پر مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔اسد اللہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت مسلمانوں کے لیے بہت ہی شدید نقصان تھا کیونکہ وہ بے انتہا جری اور آزمودہ کار سپہ سالار تھے۔

غزوۂ خندق (احزاب):

غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب مدینہ پر کفار کی آخری فوج کشی ہے اس کے بعد ان میں جرأت باقی نہ رہی، اس حملہ میں کفار قریش نے دوسرے قبیلوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور مدینہ کے یہودیوں سے بھی سازش کرلی تھی۔

اس فوج کشی کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو ملی تو آپ نے پھر مشاورت فرمائی، مسلمان اُس لڑائی میں دیکھ چکے تھے کہ جوش میں انھوں نے آنحضرت کی رائے کے خلاف مدینہ سے باہر جا کر لڑائی کی تھی اور پھر تیراندازوں نے حکم کا اتباع نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا اس لیے خودرائی سے توبہ کر کے احکام وخدا ؤ رسول کا اتباع کرنے کا تصفیہ کر چکے تھے۔ اس لیے سب نے آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق مدینہ میں رہ کر مدافعانہ جنگ کا تصفیہ کیا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''کہ ہمارے ملک میں مدافعت کا یہ طریقہ ہے کہ خندق کھود لیتے ہیں، دشمن اس کے اس طرف نہیں آپاتا''۔ یہ رائے آنحضرت ﷺ کو بہت پسند آئی اور مدینہ کے اطراف خندق کھودنے کا حکم دیا مسلمانوں کے ساتھ حضور اقدس ﷺ نے بھی خندق کھودنے میں شرکت کی، اس خندق کی وجہ سے دشمن کی یلغار سے مسلمان محفوظ ہو گئے۔

کفار کے متحدہ لشکر نے خندق کے باہر سے محاصرہ کر لیا، عام لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ چوری چھپے کوئی خندق کو پار کر کے آ جاتا تو مسلمان اسے ہلاک کر ڈالتے، ایک روز کفار عرب کا ایک بہت بڑا بہادر عمرو بن عبدود گھوڑے پر بیٹھ کر خندق کے ادھر آ گیا اور مقابلہ کی دعوت دی، اسے ایک ہزار بہادروں کے برابر سمجھا جاتا تھا، مگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو بالکل نوجوان تھے اس کے مقابلہ کا ارادہ کیا، آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے تلوار انھیں دی اور مقابلہ کے لیے بھیجا، عمرو نے کہا ''تیری نوجوانی پر مجھے رحم آتا ہے واپس چلا جا'' مگر انھوں نے مقابلہ کے لیے للکارا تو عمرو نے وار کیا جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیشانی پر ہلکا سا زخم آیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وار کیا تو ان کی تلوار اس کی گردن میں دھنس گئی۔

عمرو کے مارے جانے سے حملہ آوروں پر بہت رعب پڑا، دوسرے محاصرہ کی طوالت نے ان میں بددلی اور پھوٹ پیدا کر دی اور وہ خود ہی محاصرہ چھوڑ کر بھاگ گئے، احزاب کی متحدہ فوجوں کی ناکامی کے بعد کفار قریش کو پھر مدینہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

صلح حدیبیہ:

مسلمانوں کو مدینہ میں سکون واطمینان حاصل ہو گیا تھا مگر کعبہ سے دوری ان کے دل میں خلش

پیدا کرتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ وہ اوران کے ساتھ مسلمانوں کی جماعت مکہ جا کر مراسم عمرہ ادا کرے چنانچہ قافلہ عمرہ کی نیت سے روانہ ہوا۔

مسلمانوں کے ساتھ ہتھیاروں میں صرف تلواریں تھیں اور انھیں بھی نیام میں رکھا گیا تھا تا کہ یہ شبہ بھی نہ ہو سکے کہ اس سفر کا مقصد جنگ ہے اور حاجیوں کے ساتھ قربانی کے جانور بھی تھے جو اس قافلہ کی نیت کو واضح کرتے تھے۔

آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی یہ جماعت جب مکہ کے قریب پہنچی تو کفار کے سفیروں نے آگے بڑھنے سے روکا، آنحضرت ﷺ نے صاف لفظوں میں بتایا کہ ہمارا مقصد جنگ نہیں ہے جیسے سارے عرب کے لوگ عمرہ کے لیے آتے ہیں ہم بھی آئے ہیں، عمرہ کے بعد واپس ہو جائیں گے۔ مگر انھوں نے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی۔ آنحضرت ﷺ نے صلح کی گفتگو کرنے کے لیے حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تا کہ وہ داخلہ کے شرائط طے کریں، مکہ والوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو قید کر لیا۔

مسلمانوں کے پاس یہ افواہ پہنچی کہ مکہ والوں نے آنحضرت ﷺ کے سفیر کو قتل کر دیا ہے تو آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں سے جہاد کی بیعت لی اور فرمایا کہ اگر عثمان قتل کر دیئے گئے ہیں تو حرام سرزمین کو حلال کر دیا جائے گا اور وہاں جنگ ہوگی۔ جب اس بیعت کا حال مکہ والوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا اور صلح کی گفتگو کے لیے اپنا نمائندہ بھیجا۔

آنحضرت ﷺ نے جن شرائط پر صلح کر لی وہ بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں مگر آخر یہی صلح نامہ فتح مکہ کا اصل سبب بنا۔ صلح نامہ میں طے کیا گیا کہ بہر حال اس وقت مسلمان بغیر عمرہ کیے واپس لوٹ جائیں اگلے سال وہ حج کے لیے آسکتے ہیں مگر مکہ میں تین دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکتے۔ معاہدہ میں شرط رکھی گئی کہ اگر مسلمانوں میں سے کوئی کافروں سے جا ملے تو کافر اسے مسلمانوں کو واپس نہ دیں گے لیکن اگر کوئی کافر مسلمان ہو کر آنحضرت ﷺ کے پاس چلا آئے گا تو اسے واپس کرنا پڑے گا۔ معاہدہ میں دس سال تک آپس میں جنگ نہ کرنے کو بھی شامل کیا گیا اور اس جنگ بندی کو دوسرے قبیلوں کے لیے بھی عام کر دیا گیا کہ جو قبیلے کسی فریق سے معاہدہ کر لیں گے وہ اس معاہدہ میں شامل

سمجھے جائیں گے اور ان سے بھی لڑائی نہیں کی جا سکے گی۔

معاہدہ کی یہی آخری شرط فتح مکہ کا سبب بنی کیونکہ قریش نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ پر دھوکے سے حملہ کر کے اس کے بہت سے آدمی قتل کیے جس کی شکایت آنحضرت ﷺ تک پہنچی اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے مکہ فتح کرنے کے پوری رازداری کے ساتھ مسلمان فوج کو مکہ کی طرف بڑھا دیا۔ جس کی تفصیل فتح مکہ کے ذکر میں آ رہی ہے۔

غزوۂ خیبر:

یہودی اسلام سے پہلے تو اس نبی کے انتظار میں تھے جو عرب سے ظاہر ہوگا اور اکثر اپنے مخالفوں کو ڈرایا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں کے ظہور کے ساتھ سب کو یہودیوں کی مخالفت کا بدلہ ملے گا مگر جب آنحضرت ﷺ اللہ کی طرف سے رسول بن کر لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے لگے تو اسلام اور مسلمانوں کی شدید مخالفت انھیں یہودیوں کی طرف سے کی جانے لگی جس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے دین میں جو باتیں اپنی طرف سے گڑھ کر شامل کی تھیں اسلام نے ان کی تصدیق نہیں کی۔

مدینہ میں بھی کثرت سے یہودی آباد تھے اور بڑا اثر رکھتے تھے اور اکثر اسلام کے خلاف سازشیں اور مخالفتیں کرتے رہتے تھے جس کی سزا میں ان میں سے بہت مدینہ سے نکال دیئے گئے کچھ قتل کر دیئے گئے۔ مدینہ سے جانے والے یہودیوں نے خیبر کے قریب اپنے مضبوط قلعے بنا لیے تھے اور مسلسل جنگی تیاری میں مشغول تھے کہ فرصت ملتے ہی مدینہ پر حملہ کریں۔

کفار قریش سے دس سالہ جنگ بندی کا معاہدہ ہو جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے مناسب سمجھا کہ یہودی فتنہ کو ختم کیا جائے۔ مسلمانوں کی فوج خیبر کی طرف پہنچ گئی۔ یہودیوں کے قلعوں میں سب سے مضبوط اور بڑا قلعہ خیبر کا ہی تھا اور اس کا سپہ سالار مرحب جنگ آزما بہادر تھا اسے بھی ایک ہزار بہادروں کے برابر مانا جاتا تھا، چنانچہ اصل لڑائی خیبر کے قلعہ کے فتح کرنے کے لیے ہوئی۔

غزوۂ خیبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس لڑائی میں مسلمان مردوں کے ساتھ مسلمان عورتوں نے بھی شرکت کی جو لڑنے والوں کا دل بڑھاتیں اور زخمیوں کی تیمارداری کرتی تھیں۔

لڑائی کا طریقہ یہ تھا کہ مرحب اپنی فوج لے کر قلعہ سے باہر نکلتا مسلمان حملہ کرتے اور جب مرحب محسوس کرتا کہ مسلمانوں کا زور بڑھ رہا ہے تو چپکے سے اپنی فوجوں کو قلعہ کی طرف ہٹنے اور بھاگ جانے کا اشارہ کرتا، مسلمان جوش میں پیچھا کرتے، خیبر والے قلعہ میں گھس کر دروازہ بند کر لیتے اور قلعہ کی دیواروں پر سے مسلمانوں پر تیر اور پتھر برسائے جاتے جس سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچتا۔

اس طرح بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے، ایک روز آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''میں ایسے شخص کو فوج کا علمدار بناؤں گا جو خیبر کو فتح کر کے لوٹے گا''۔ دوسرے دن صبح آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سب حاضر ہوئے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود نہ تھے، فرمایا ''علی کہاں ہیں؟'' معلوم ہوا کہ ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے اس لیے حاضر نہیں ہو سکے، انھیں طلب کیا گیا اور لعاب دہن ان کی آنکھوں میں لگایا اور لڑائی کے لیے میدان میں بھیجا۔

اس روز بڑی شدید لڑائی ہوئی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دشمن کو قلعہ میں بھاگ کر دروازہ بند کر لینے کا موقعہ نہیں دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ قلعہ کا دروازہ توڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ داخل ہوئے، مرحب کو معلوم ہوا کہ مسلمان قلعہ کے دروازہ میں داخل ہو رہے ہیں تو وہ پلٹ کر مقابلہ کے لیے آیا، بڑے زور سے گرجا اور اپنی بہادری کی تعریف میں اشعار پڑھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی شعر کا جواب شعر سے دیا اور اسے بتایا کہ مجھے تو میری ماں حیدر کے نام سے پکارتی تھی جس کے معنیٰ شیر کے ہیں، اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے پر وار کیے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ضرب اتنی شدید تھی کہ مرحب روک نہ سکا اور وہیں قتل ہوا۔

اس طرح خیبر کی فتح سے یہودیوں کا زور ٹوٹ گیا اور مسلمانوں کو بے شمار مال و دولت غنیمت میں حاصل ہوا۔

اسلامی سفارتیں:

صلح حدیبیہ کے بعد جنگ آزمائی سے ایک حد تک سکون مل گیا تھا۔ خیبر کی فتح کے بعد یہودیوں کی فتنہ پردازیوں پر بھی قابو پا لیا گیا، اس حالت امن کو آنحضرت ﷺ نے اسلام کی تبلیغ عام کرنے کے لیے اس طرح استعمال کیا کہ مختلف روسا و سلاطین اور سرداران قبیلہ کے نام اسلام کے پیغامات

بھیجے، ان ناموں کے رسالت پر مہر استعمال کی گئی جس پر محمد رسول اللہ کندہ تھا۔

بحرین اور عمان کے بادشاہوں نے اسلام قبول کیا، غسانی سردار شرجیل نے آنحضرت ﷺ کے قاصد کو قتل کر دیا جس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی فوج بھیجی، غسانی سردار رومی سلطنت سے وابستہ تھا اس نے رومی فوج اپنی مدد کے لیے بلالی جو بہت زبردست اور آزمودہ کار تھی اور ایران کو شکست دے چکی تھی، موتہ پر یہ لڑائی ہوئی جس میں مسلمانوں کے تین سپہ سالار شہید ہوئے پھر علم حضرت خالد بن ولید نے لیا اور ایسی شدید لڑائی لڑی کہ اس دن ان کے ہاتھ میں آٹھ تلواریں ٹوٹیں۔

مسلمان فوج صرف تین ہزار تھی اور دشمن کی فوج ایک لاکھ تھی اس لیے حضرت خالد نے نہایت قابلیت سے اپنی فوج کو پیچھے ہٹایا اور دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کر واپس ہوئے۔ مسلمان صرف بارہ شہید ہوئے، دشمن کے نقصان کا صحیح اندازہ نہ ہوسکا۔

فتح مکہ:

صلح حدیبیہ میں جنگ بندی کو عام کرنے کے لیے طے کیا گیا تھا کہ دوسرے قبیلے بھی اس معاہدہ میں شامل ہوسکتے ہیں چنانچہ خزاعہ نے مسلمانوں سے حلف کر لیا اور بنوبکر قریش کے ساتھ ہو گئے۔ اس طرح یہ صلح عالم عرب کے لیے انس کا پیام بنی۔ مگر بنوبکر اور قریش نے بدعہدی کی اور خزاعہ پر حملہ کر کے ان کے بہت سے آدمی قتل کیے، انھوں نے بھاگ کر کعبہ میں پناہ لی جس کے متعلق طے ہے کہ وہ جائے امن ہے وہاں قتل و غارت نہیں ہوسکتی مگر خزاعہ کو کعبہ میں بھی قتل کیا گیا، دو خزاعی بھاگ کر مدینہ پہنچے اور آنحضرت ﷺ سے فریاد کی اور حلیف کی مدد کے لیے وعدہ یاد دلایا۔

آنحضرت ﷺ نے خزاعہ کے ساتھ اس بدعہدی کا بدلہ لینے اور مکہ کو ہمیشہ کے لیے کفر سے آزاد کرنے کے لیے تیاری شروع فرمائی۔ قریش کو معلوم ہوا کہ کچھ خزاعی مدینہ پہنچے ہیں تو انھیں فکر ہوئی کہ کہیں آنحضرت ﷺ حدیبیہ کی صلح کو ختم نہ کر دیں اس لیے معاہدہ کی تجدید کے لیے ابوسفیان نے مدینہ کا سفر کیا اور خواہش کی کہ معاہدہ کی دوبارہ تجدید کی جائے۔ مسلمانوں نے کہا معاہدہ دس سال کا ہے اس لیے ابھی مدت باقی ہے تجدید کی ضرورت نہیں، ہاں اگر تم نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو نئے معاہدہ

کے لیے درخواست کرو۔ ابوسفیان نے معاہدہ شکنی کا اقرار نہیں کیا اور یہی چاہا کہ معاہدہ کی تجدید ہو جائے، اس پر کسی نے توجہ نہ کی تو خود ہی یک طرفہ اعلان کر دیا کہ میں نے حدیبیہ کے معاہدہ صلح کی تجدید کر دی ہے۔

رمضان ۸ ھ میں آنحضرت ﷺ دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ نہایت راز داری سے مکہ کی طرف بڑھے، اس کا اہتمام کیا گیا کہ دشمن کو مسلمانوں کی نقل وحرکت کا علم نہ ہونے پائے اور اچانک اتنی زبردست فوج دیکھ کر مرعوب ہو جائے۔ مکہ کے قریب وادی میں قیام فرمایا، رات کو ہر شخص نے کھانا پکانے کے لیے علیحدہ چولہا جلایا تو اس کی روشنی سے ساری وادی جگمگا گئی، مکہ والوں نے جو یہ روشنی دیکھی تو پریشان ہو گئے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے لوگ اس طرف دوڑے۔

مسلمانوں کی فوج میں آنے جانے کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ ابوسفیان حالات کا اندازہ کرنے کے لیے اس طرف آئے تو خوش قسمتی سے سب سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہو گئی، انھوں نے سمجھایا کہ ''مسلمان صبح کو لازمی طور پر مکہ میں داخل ہو جائیں گے تم مقابلہ کرنا بھی چاہو تو نہ کر سکو گے اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ تمہارا انجام وہی ہو گا جو تم سمجھ سکتے ہو اور اگر تم مسلمان ہو گئے تو یقیناً تمہارے ساتھ معافی کا برتاؤ کیا جائے گا''۔ ابوسفیان نے اپنے آپ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی امان میں دے دیا، اس کے بعد سیدنا فاروق اعظم کا ادھر گذر ہوا، انھوں نے جو قریش کے سردار کو دیکھا تو قتل کر دینے کا ارادہ کیا مگر وہ حضرت عباس کی امان میں تھے اس لیے آنحضرت ﷺ نے انھیں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہی سپرد کر دیا۔

صبح کو مکہ کی طرف مسلمانوں نے کوچ کیا، آنحضرت ﷺ نے ہدایت دی کہ جب تک تمہارا مقابلہ نہ کیا جائے تم ہتھیار نہ اٹھاؤ اور پُرامن طور پر مکہ میں داخل ہو جاؤ۔ مسلمانوں کی مختلف ٹکڑیاں علیحدہ سپہ سالاروں کی قیادت میں متعدد راستوں سے مکہ کی طرف بڑھیں، اکثر لوگ بغیر کسی مزاحمت کے مکہ میں داخل ہو گئے۔ حضرت خالد بن ولید کو تھوڑا سا مقابلہ کرنا پڑا، اس طرح مکہ پر اسلامی اقتدار قائم ہو گیا۔

فتح کے بعد آنحضرت ﷺ نے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا، خانۂ کعبہ کی کنجیاں حاصل فرما کر کعبہ

کے اندر جا کر نفل ادا فرمائے اور خطبۂ فتح ارشاد فرمایا......

الحمدللّٰہ وحدہ نصر عبدہ محمداً و حزبہ ھزم الاحزاب جندہ

سب تعریف اللہ کے لیے ہے، اللہ نے اپنے بندہ کی مدد فرمائی، محمد اور اس کے ساتھیوں کی، دشمنوں کی جماعتوں اور فوجوں کو شکست دی۔

حمد کے بعد حاضرین سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے، میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟" اس سوال پر گردنیں شرمندگی سے جھک گئیں مگر اخلاق رسالت کا اندازہ کرنے والوں نے جواب دیا، اخ کریم و ابن اخ کریم "آپ مہربان بھائی اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں"۔ یعنی آپ سے یہی توقع ہوسکتی ہے کہ آپ مہربانی اور معافی کا معاملہ کریں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جاؤ تم سب آزاد ہو" اور پھر امان عام کا اعلان فرمایا کہ جو کوئی ہتھیار ڈال دے گا، خانہ کعبہ میں آجائے گا، اپنے گھر میں بیٹھ رہے گا، سب کو امان دی گئی۔ عام خیال تھا کہ سب کو معافی مل جائے گی مگر ابوسفیان اور اس کی بیوی ھندہ کو معافی نہیں مل سکے گی، لیکن آنحضرت ﷺ نے اعلان کر دیا ابوسفیان کو امان دی گئی۔ ان کے گھر والوں کو امان دی گئی۔ اگر کوئی غیر شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے تو اسے بھی امان دی گئی۔

فتح مکہ کے اثر اور عام معافی کے اعلان نے ان لوگوں کو بہت متاثر کیا جو مسلسل اسلام دشمنی پر کمر بستہ رہے تھے اور لوگ کثرت سے اسلام قبول کرنے لگے۔ صرف چند ہی آدمی مخالفت پر قائم رہے اور انھوں نے مکہ چھوڑ دیا۔ جن لوگوں کا قتل ضروری تھا ان میں سے کچھ بھاگ گئے کچھ قتل کیے گئے، بھاگ جانے والوں میں سے کعب بن زہیر گھومتے گھامتے مدینہ پہنچے، نعت میں قصیدہ پڑھا، مسلمان ہوئے اور سرکار کی یمنی چادر انعام میں پائی۔ عکرمہ بن ابوجہل بھی بھاگ گئے تھے مگر جب ان کی کشتی طوفان میں پھنسی تو انھیں بھی اسلام کی سچائی کا یقین آگیا اور مسلمان ہو کر حاضر ہوئے اور اسلام کی خدمت میں مشغول رہے۔

غزوۂ حنین:

مکہ کے فتح ہو جانے اور کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیئے جانے کو عام طور پر عرب میں اسلام کی صداقت کی نشانی سمجھا گیا لیکن ہوازن اور بنوثقیف وغیرہ نے اسے اہل مکہ کی بزدلی اور کمزور قیادت کا

نام دیا اور خود جنگی تیاری مکمل کی۔

یہ لڑائی اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے بعد کوئی بڑی لڑائی نہ ہوئی اور اس لیے بھی کہ اس لڑائی میں مسلمانوں کو یہ سبق بھی ملا کہ شکست و فتح طاقت سے نہیں نصرتِ الٰہی سے ہوتی ہے۔

مسلمانوں کو جب ان قبائل کی جنگ کے لیے تیاری کا علم ہوا تو مسلمانوں نے پیش قدمی کی مسلمان لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی اور مسلمانوں میں یہ خیال عام طور پر پایا جاتا تھا کہ اتنی بڑی تعداد کا دشمن مقابلہ نہ کر سکے گا مگر جب مسلمان وادی میں داخل ہوئے تو دشمن پہلے سے تیاری کر چکا تھا سامنے اس کی فوج تھی جس کے مقابلہ کے لیے اسلامی لشکر آگے بڑھا مگر دشمن نے دونوں طرف پہاڑیوں میں تیر انداز چھپا رکھے تھے جب مسلمان ان کے درمیان پہنچ گئے تو اچانک ہر طرف سے تیروں کی بارش ہو نے لگی اور مسلمان نہایت پریشانی میں پراگندہ ہو گئے میدان میں اللہ کا رسول موجود رہا اور اس نے فرمایا ''میں نبی ہوں، یہ بات جھوٹ نہیں اور میں عبدا ﷺ کا فرزند ہوں''۔

پھر آنحضرت ﷺ نے مختلف مسلمان گروہوں کو آوازیں دلائیں اور جو مسلمان پراگندہ ہو کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے ان کے قدم رک گئے اور وہ آنحضرت ﷺ کے گرد جمع ہونا شروع ہوئے، مسلمانوں نے محسوس کر لیا کہ کثرت تعداد اور طاقت کا گھمنڈ مسلمان کو زیب نہیں دیتا، تو ہوازن و ثقیف وغیرہ کو مکمل شکست ہوئی، ان کے تقریباً چھ ہزار آدمی زخمی اور قیدی ہوئے، اکہتر مارے گئے۔

آنحضرت ﷺ نے فتح کے بعد قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کر دیا۔ مالِ غنیمت میں ان لوگوں کو سب سے زیادہ حصہ دیا جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو کر اسلامی لشکر میں شامل ہوئے تھے، ان پر یہ احسان ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے تھا۔

عام الوفود:

مکہ کی فتح اور حنین کی لڑائی میں کامیابی سے پورے عرب علاقہ میں اسلام دشمنی کا خاتمہ ہو گیا اور ہر طرف سے قبیلوں کے وفد مدینہ میں آ آ کر اسلام قبول کرنے لگے اس لیے سنہ ۹ ھ کو تاریخ اسلام میں عام الوفود (وفدوں کا سال) کہا جاتا ہے۔

عرب میں اسلام کی عام اشاعت ہو جانا اس بات کا اشارہ تھا کہ جس کام کے لیے آنحضرت

ﷺ تشریف لائے تھے وہ مکمل ہوگیا ہے اور اسلامی جماعت آئندہ ساری دنیا میں اس دین کو پھیلانے کی ذمہ دار بن سکتی ہے، تو گویا یہ آنحضرت کے وصال فرمانے کا اشارہ بھی تھا چنانچہ جب سورۂ نصر (اذا جاء نصر اللّٰہ و الفتح) نازل ہوئی تو مخصوص اصحاب رسول رو پڑے تھے اور انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ جدائی کا وقت آپہنچا ہے۔

حجۃ الوداع:

آنحضرت ﷺ نے حج کا ارادہ فرمایا، یہ آخری حج تھا اس حج کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے جبل رحمت سے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں تمام اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

رنگ و نسل، دولت مند اور مفلس، آقا اور غلام، مرد اور عورت سب کو اسلامی برادری میں مساوی درجہ دیئے جانے کا اعلان فرمایا۔ تمام ہدایات بیان فرمانے کے بعد مجمع سے مخاطب ہو کر پوچھا ''کیا میں نے تم تک سب احکام پہنچا دیئے ہیں؟'' مجمع نے جواب میں ہاں کہا۔ تو خدا تعالیٰ سے عرض کیا ''اے اللہ! گواہ رہ کہ میں نے کام مکمل کر دیا'' اور پھر سب سے فرمایا ''یہ کام اب تمہارا ہے کہ جو لوگ دین مجھ سے سیکھ چکے ہیں وہ ان لوگوں تک پہنچائیں جو موجود نہیں ہیں''۔

وصال مبارک اور انتخاب خلیفہ:

بہت مختصر علالت کے بعد آنحضرت ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے زانو پر سر رکھے ہوئے وصال فرمایا۔ وصال کی خبر سن کر مسلمانوں پر ایک حیرت کی کیفیت چھا گئی، کسی کو یقین ہی نہ آتا تھا مگر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں سے خطاب فرمایا اور قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو جیسے لوگ خواب سے بے دار ہو گئے اور سب کو یقین آ گیا کہ آنحضرت ﷺ کا وصال ہوگیا ہے۔

اس خبر کے عام ہوتے ہی جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوگیا، بنو ہاشم جو رشتہ میں آنحضرت ﷺ سے قریب تر تھے ان کا خیال یہ تھا کہ ان میں سے حضرت علی کو خلیفہ بنایا جائے، انصار کا خیال تھا کہ چونکہ اسلام کی خدمت میں سب سے زیادہ جاں نثاری انصار نے دکھائی ہے اس لیے ان میں سے خلیفہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ ثقیفہ میں لوگ جمع ہو گئے اور انتخاب کے لیے رائے لینے اور جانشینی کا اعلان کرنے کی

تیاری ہونے لگی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً اس اجتماع کی اطلاع حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ ثقیفہ پہنچے، وہاں حالت نازک تھی، انصار اور مہاجرین میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور قریب تھا کہ آپس میں لڑائی شروع ہو جائے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے انصار اور مہاجرین کی فضیلت بیان کی، دونوں کی اسلامی خدمات کو سراہا اور مجمع کو قابو میں کرنے کے بعد اس پر سب کو راضی کر لیا کہ ''امیر'' قریش میں سے ہو اور اس کے وزیر انصاری ہوں اور کہا تم کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لو میں تمہارے ساتھ بیعت کر لوں گا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام لیا اور کہا ''اللہ کے رسول نے آپ کو نماز کے لیے اپنا جانشین بنایا تھا، دینی اعتبار سے آپ ہی جانشین ہیں، ہم اپنی دنیا کے لیے بھی آپ کو ہی امیر تسلیم کرتے ہیں''۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بیعت کر لینے کے بعد سب نے بالاتفاق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بنو ہاشم نے بھی اسی انتخاب کو تسلیم کر لیا اور عام رائے کا احترام کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے عزیزوں نے بھی بیعت کر لی۔

اسلامی کارنامہ:

اسلام سے پہلے انسانوں کی ہدایت کے لیے مختلف مذاہب آئے تھے جو اپنے اپنے وقتوں میں اپنی جگہ پر درست تھے مگر جس وقت اسلام کا پیام لے کر آخری نبی تشریف لایا اس وقت کوئی آسمانی مذہب بھی اپنی اصل حالت میں موجود نہ تھا، اس لیے سارے عالم کو ہدایت کی ضرورت تھی۔

اسلام کا ابتدائی پیام ایک ایسے خطہ میں دیا گیا جس میں گذشتہ دینوں کے نام لیوا بھی موجود تھے اور دوسرے باطل عقیدے رکھنے والے بھی موجود تھے، غالباً قدرت کو یہ دکھانا منظور تھا کہ خدا کا وہ فرمان جو ساری انسانیت کے لیے ہے عرب جیسے مختلف عقیدے رکھنے والے اور ہر قسم کی خرابیوں میں مبتلا لوگوں میں سنا جا سکتا ہے اور ان کی زندگی کو ہدایت کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے تو پھر ساری دنیا

میں ہر جگہ اسے کامیابی لازمی ہے۔

اسلام نے جو بنیادی عقیدہ اللہ کے ایک ہونے کا پیش کیا ہے وہ اتنا صاف اور سیدھا سادا ہے کہ اسے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی اور اس پر ایمان لانے کے لیے صرف دل سے یقین اور زبان سے اقرار کے بعد ہر شخص مسلمان ہو جاتا ہے اور توحید و رسالت پر ایمان اسے اسی صف میں لا کھڑا کرتا ہے جس میں چھوٹے بڑے، کالے گورے میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جاتا، عقیدہ کی یکسانیت ہر قسم کا فرق میٹ دیتی ہے۔

عرب کی جاہلیت میں جو حالت تھی وہ سب کو معلوم ہے، ہر قسم کے اختلافات اور عیوب ان میں موجود تھے اور ان سب کے باوجود وہ اپنے برابر کا کسی کو نہ سمجھتے تھے، اسلام کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے بہت مختصر عرصہ میں ان کی اصلاح کی اور وہی قوم ایک منظم اور متحد قوم بن گئی اور اللہ کے راستہ میں ایسی سرفروشانہ خدمات انجام دیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام کی آواز دور دراز ملکوں تک پہنچا دی۔

خلافت راشدہ:

آنحضرت ﷺ کے بعد مسلمانوں کے اجتماع نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنا امیر بنایا تو وہ ''خلیفۃ رسول اللہ'' (اللہ کے رسول کے نائب) کہلائے۔ تاریخ اسلام میں وہ تیس سال کی مدت جس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلامی حکومت کے انتظامات چلائے، ''خلافت راشدہ'' کا زمانہ کہلاتا ہے۔

خلافت راشدہ کے آغاز میں ہی مسلمانوں کو شدید آزمائش پیش آئی، عرب کے مختلف قبیلے جو عہد رسالت کے آخر میں اسلام لائے تھے اطاعت سے پھر گئے، بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور بعض مختلف جھوٹے مدعیان نبوت پیدا ہو گئے۔ اگر اس فتنہ کی فوری سرکوبی نہ کی جاتی تو اسلام صرف مدینہ کی چار دیواری میں گھر کر رہ جاتا۔

خلیفۂ رسول اللہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پوری شدت سے اس فتنہ کا سد باب کیا اور اسی کے ساتھ ان علاقوں کی طرف بھی توجہ فرمائی جہاں سے اسلام دشمنوں کو مدد مل سکتی تھی شام کے

علاقہ پر اور عراق کے علاقہ پر فوجیں روانہ ہوئیں، اگرچہ فتوحات کی تکمیل بعد کے زمانہ میں ہوئی مگر کام کا آغاز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہی کر دیا گیا۔

مرتدین کے خلاف جہاد میں بہت سے قرآن کے حفاظ شہید ہوئے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ قرآن کو کتاب کی صورت میں محفوظ کر لیا جانا چاہیے ورنہ حفاظ کے اٹھ جانے سے خدانخواستہ قرآن ضائع ہو جائے گا۔ حضرت صدیق اکبر نے آنحضرت ﷺ کے خاص کاتب وحی سیدنا زید بن ثابت انصاری کو یہ کام سونپا کہ وہ کامل احتیاط سے قرآن کو کتابی صورت میں لکھ ڈالیں اور پھر اسے محفوظ فرما دیا گیا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب فتوحات وسیع ہو گئیں اور مسلمانوں دور دراز علاقہ میں آباد ہو گئے تو انھوں نے اسی نسخہ سے جو عہد صدیقی میں مرتب کیا گیا تھا نقلیں تیار کرا کے صوبوں کے صدر مقامات پر روانہ کیں، ان نقول کی نگرانی بھی سیدنا زید بن ثابت نے ہی فرمائی۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ خلافت راشدہ کا عہد زریں اسلامی فتوحات کے علاوہ علمی سرگرمی کے لیے بھی نشان راہ ہے کیونکہ عربی میں قرآن سے پہلے کوئی کتاب اس طرح لکھی ہوئی پائی نہیں جاتی تھی اور پھر قرآن کے لکھے جانے کے بعد وہ تمام علوم جن کا کسی نہ کسی طرح قرآن سمجھنے اور آنحضرت ﷺ کی ہدایات کو محفوظ رکھنے سے تعلق ہے، آہستہ آہستہ مدون ہونے شروع ہو گئے۔

علمی ترقی کے علاوہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ فتوحات کے ساتھ ہی ساتھ انتظامات ملکی کے لیے قوانین بھی مرتب کیے گئے اور باضابطہ دیوان خراج قائم ہو گیا جو پوری طور پر مفتوحہ علاقوں کے انتظام کی نقل نہیں تھا۔ اسلامی اصولوں کو سامنے رکھ کر قوانین بنائے گئے تھے اور یہ سب ان عربوں نے کیا تھا جو اسلام قبول کرنے سے پہلے جاہل کہے جاتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام صرف ایک عقیدہ ہی نہیں ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اسے سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے تو مسلمان ہر زمانہ کی مشکلات کا حل پیش کر سکتے ہیں۔

انتخاب فاروقی:

آنحضرت ﷺ نے وصال سے قبل کسی کو خلافت کے لیے منتخب نہیں کیا تھا، جس کی وجہ سے

وصال مبارک کے بعد مسلمانوں میں پھوٹ پڑ جانے کا امکان ہو گیا تھا۔ اگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نہ پہنچ جاتے تو مسلمان مہاجرین اور انصار میں بٹ جاتے اور پھر مہاجرین میں بھی مختلف خاندان علیحدہ علیحدہ ہو جاتے یہی خطرہ پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بعد پیش آ سکتا تھا اس لیے انھوں نے مناسب سمجھا کہ اپنی موجودگی میں ہی اپنے بعد کے لیے بیعت لے لیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مختلف اکابر صحابہ سے مشورہ کیا اور سیدنا فاروق اعظم کے متعلق ان کی رائے معلوم کی اگر چہ اکثر لوگوں نے ان کی سختی سے ڈر کا اظہار کیا مگر کسی نے بھی ان کی اہلیت واستحقاق کے خلاف رائے نہ دی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ سختی اسی وقت ہے جب تک ان پر بوجھ نہیں پڑتا، ذمہ داریاں خود ہی انھیں نرم مزاج بنا دیں گی اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ولایت عہد کا اعلان لکھوایا اور سب سے اپنے بعد کے لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اطاعت کا عہد لیا۔

یہ انتخاب ایک نیا قدم تھا مگر اس پر غور کریں تو کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ یہ انتخاب عام مشاورت کے بعد کیا گیا تھا دوسرے اس کی بنیاد بالکلیہ صلاحیت پر تھی، کسی قسم کا ذاتی تعلق ان دونوں میں ایسا نہ تھا جسے اس انتخاب میں سامنے رکھا گیا ہو اور یہی وجہ ہے کہ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جانشینی کا اعلان کیا گیا تو کسی نے بھی اس کی مخالفت میں آواز نہ اٹھائی اور سب نے بیعت اطاعت کر لی۔

مرد آہن:

فاروق اعظم کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو انھیں بجا طور پر ''مردِ آہن'' فولادی انسان کہا جا سکتا ہے، ان جیسا عزم واعتماد خاص شخصیتوں میں ہی پایا جا سکتا ہے وہ جس بات کو حق جانتے تھے اس کے لیے پوری جرأت سے اقدام کرتے تھے اور دوسروں سے بھی اسی فولادی ارادہ اور سخت کوشی کا مطالبہ کرتے تھے جس کی وہ خود سب سے اعلیٰ مثال تھے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد انھوں نے جو پہلا خطبہ دیا اس میں اپنی پالیسی بہت ہی خاص انداز سے بیان کی، کسی سے کوئی وعدہ نہیں لیا بلکہ کہا'' حاضرین! میں اللہ سے دعا کرتا

ہوں سب آمین کہیں''، یعنی اس دعا میں شریک ہوں اور پھر دعا میں وہ سب کہہ دیا جس پر وہ عمل کرنے والے تھے اور اس کی کامیابی کے لیے سب نے آمین کہی۔

اتنی بڑی سلطنت اور ایسے سخت عزم کے باوجود اپنی زندگی میں سادگی کی ایسی مثال تاریخ میں ملنی مشکل ہے اور کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ جتنی شفقت اور ہمدردی کا برتاؤ وہ کرتے تھے اسے دیکھ کر یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا تھا کہ یہ وہی عمر ہیں جن کے نام سے ایک دنیا کانپتی ہے۔ جب ایک رات شہر سے باہر ایک عورت کو خالی ہانڈی کے نیچے آگ جلا جلا کر بھوکے بچوں کو بہلاتے ہوئے دیکھا تو بیت المال سے کھانے کا سامان اپنی پیٹھ پر لاد کر لے گئے اور بیٹھ کر کھانا تیار کرایا۔ بچوں کو کھلایا اور جب رخصت ہونے لگے تو اس عورت نے شکریہ میں کہا ''اے شخص اللہ تیرا بھلا کرے تو عمر سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے''۔

عہد فاروقی میں اسلامی فتوحات میں بے حد وسعت حاصل ہوئی، اس وقت کی دنیا کی دو بڑی سلطنتوں ایران و روم کو شکست کھانی پڑی۔ ایران تو مکمل طور پر فتح ہوگیا، رومی سلطنت کے اکثر مشرقی مقبوضات پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا، مصر و افریقہ میں دور دور تک اسلام پہنچ گیا اور سارا عرب، شام، فلسطین اسلامی مملکت میں شامل ہوگیا۔ اگر اور کچھ دن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حیات رہتے تو اسلامی فتوحات ساری دنیا کو گھیر لیتیں کہ ایک بدبخت کے ہاتھوں حالت نماز میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو مہلک زخم پہنچا اور اسی کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

انتخاب عثمانی:

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے زخمی ہونے کے بعد اپنے جانشین کے سلسلہ میں فرمایا ''اگر اسامہ زندہ ہوتے تو میں انھیں جانشین بنا دیتا، اب میں یہ مسئلہ ان چھ لوگوں کے سپرد کرتا ہوں جن میں سے ہر ایک اس ذمہ داری کا اہل ہے، یہ ان میں ہیں جو سب سے پہلے مسلمان ہوئے اور اسلام کی خدمت میں سرگرم رہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان میں سے ہر ایک کو جنتی فرمایا ہے'' اور فرمایا کہ ''ان چھ آدمیوں کو ایک مکان میں جمع کر دیا جائے کہ وہ باہم تبادلۂ خیال کے بعد اپنے میں سے کسی کو خلیفہ بنا لیں، اگر رائیں مساوی ہوں تو اس مشاورت میں عبداللہ بن عمر کو شریک کیا جائے لیکن وہ خلافت کے

دعویدار نہیں ہو سکتے''۔

مجلس مشاورت نے کئی روز تک بحث جاری رکھی اور زیادہ تر لوگوں نے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو پسند کرلیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی خلافت کو تسلیم کر لیا اور ان کی حیات میں کبھی اپنے آپ کو خلیفہ بنائے جانے کا کوئی ارادہ تک ظاہر نہیں کیا۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نہایت نرم دل اور سخی تھے اس لیے ان کی خلافت کو لوگوں نے بہت ہی اچھا سمجھا۔ اور سب لوگ ان کی اطاعت میں رہے۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا شروع کا دور نہایت زریں ہے، نرم برتاؤ کے باوجود انتظامات ملکی میں کوئی خرابی نہیں پائی جاتی اور فتوحات اسلامی کا سلسلہ بھی برابر آگے بڑھتا رہا، مگر بعد میں حالات خراب ہونے لگے۔ کیونکہ ان کی نرمی سے ایسے لوگ بھی حکومت کے معاملات میں دخیل ہو گئے جن میں وہ خلوص اور دیانت مفقود تھی جو اسلامی حکام میں لازمی ہے۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن کے اس نسخہ کی نقلیں تیار کرائیں جو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں نہایت صحت کے ساتھ لکھ لیا گیا تھا اور یہ نقلیں اسلامی حکومت کے بڑے بڑے صوبہ داروں کو بھیج دیں تاکہ کسی جگہ بھی قرآن میں کسی قسم کی غلطی داخل نہ ہو سکے۔

فتنہ اور شہادت سیدنا عثمان غنی:

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی نرمی سے ان کے خاندان کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدہ حاصل کرنے کا شوق ہوا، شروع میں انھوں نے جوش بھی دکھایا اور اسلامی فتوحات میں سرگرم ہوئے مگر اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے ماتحتوں پر بے جا سختیاں بھی کرنی شروع کر دیں اور چونکہ خلافت کے دربار میں مروان جیسا آدمی موجود تھا اس لیے حکام کے خلاف شکایات پر ان حاکموں کو سزا دی جانے کی بجائے ان ظالم حاکموں کی طرف داری کی جانے لگی اور شکایتوں کو حکومت کے خلاف اقدام سے تعبیر کیا گیا جس سے بددلی پیدا ہوئی اور اس بددلی سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا جو سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اس مرتبہ سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔

حج کے زمانہ میں مختلف شہروں کے لوگ جن میں مصر والے پیش پیش تھے مکہ جانے کی بجائے

مدینہ پہنچے اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ظالم حکام کی شکایت کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ وہ مصر کا حاکم محمد بن ابوبکر کو بنادیں، انھوں نے یہ بات مان لی اور مصر کی ولایت کا فرمان محمد بن ابوبکر کے لیے لکھ دیا جس کے بعد یہ لوگ واپس گئے۔

مروان کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے حاکم مصر کو خود ہی ایک فرمان لکھ کر اس پر خلافت کی مہر لگا کر روانہ کر دیا کہ ان باغیوں کو قتل کر دیا جائے۔ مروان کا یہ فرمان راستہ میں پکڑ لیا گیا اور وہ لوگ جو پہلے صرف شکایت کر کے واپس چلے گئے تھے پھر مدینہ آئے اور اب انھوں نے مطالبہ کیا کہ مروان کو ان کے حوالہ کر دیا جائے، جب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایسا نہ کیا تو ان سے کہا گیا کہ وہ خلافت سے استعفیٰ دے دیں اور ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا، کسی قسم کی مدد تو کیا پانی تک ان تک پہنچنے کی اجازت نہ دی۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بار بار ان فتنہ پردازوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر انھوں نے کسی طرح بات نہ مانی اور ایک روز پڑوس کے مکان سے کچھ باغی سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچے اور اس حالت میں کہ وہ روزہ سے تھے اور قرآن کی تلاوت کر رہے تھے انھیں بے دردی سے شہید کر دیا۔

بیعت سیدنا علی رضی اللہ عنہ

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کئی روز تک مدینہ میں عجیب کیفیت رہی، کوئی بھی سامنے آنے اور حالات پر قابو پانے کی کوشش کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ خود حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی ان حالات میں خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، مگر جب باغیوں نے انھیں بھی قتل کی دھمکی دی اور انھوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ علیحدگی اختیار کرتے رہے تو حالات اور بھی خراب ہو جائیں گے تو انھوں نے بیعت لینے پر آمادگی ظاہر کی اور ان کے ہاتھ پر چارو ناچار سب نے بیعت کر لی۔

حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سب نے قبول کر لی تھی، خلیفۂ مقتول کی شہادت کا غم دلوں کو متاثر کیے ہوئے تھا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ باغیوں میں ایسے گھرے ہوئے تھے کہ وہ فوری طور پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل کی تلاش نہیں کر سکتے تھے اور بدلہ لینا ممکن نہ تھا، اس لیے بہت سے

اکابر جن سے خلافت کو تقویت ملنی چاہیے تھی ان سے کنارہ کش ہو گئے جس کے نتیجہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حکومت کو وہ استحکام حاصل نہ ہو سکا جو ہونا چاہیے تھا۔

مسلمانوں میں خانہ جنگیاں:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد بڑے اصحاب میں سیدنا زبیر اور سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہما نے مدینہ چھوڑ دیا۔ مکہ کے راستے میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حج سے واپس آتی ہوئی ملیں، انھوں نے مدینہ کے حالات پوچھے، جب معلوم ہوا کہ سیدنا عثما غنی رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے ہیں اور باغیوں نے بزور شمشیر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیا تو ام المومنین نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور خلیفۂ مظلوم شہید کے خون کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا۔

ام المومنین کے پاس ایسے ہزاروں جاں باز جمع ہو گئے جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لیے جانے کو سب سے مقدم سمجھتے تھے، ان لوگوں نے بڑھ کر بصرہ پر قبضہ کر لیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ بصرہ پر ان لوگوں کا قبضہ ہو گیا ہے تو انھوں نے اپنی فوجیں بصرہ کی طرف بڑھائیں۔ نامہ و پیام سے بات طے ہو رہی تھی کہ اچانک رات کی تاریکی میں لڑائی شروع ہو گئی، کچھ لوگوں نے دونوں لشکروں پر ایک ساتھ تیر چلا کر یہ فتنہ پیدا کیا غالباً یہ وہی لوگ ہوں گے جن سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لیے جانے کا امکان تھا۔

یہ لڑائی جنگ جمل کہلاتی ہے کیونکہ لڑائی کے میدان میں ام المومنین خود ایک اونٹ پر بیٹھی ہوئی لڑنے والوں کی ہمت بڑھا رہی تھیں۔ یہ لڑائی بہت تکلیف دہ اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے بہت نقصان دہ ہوئی کیونکہ دونوں طرف لڑنے والے وہی تھے جنھوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اور اگر وہ متحد رہتے تو بہت جلد اسلام کے پیام کو ساری دنیا میں پہنچا دیتے۔ اس لڑائی میں سیدنا زبیر اور سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تو یہ لڑائی ختم ہوئی۔

جمل کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دوسری لڑائی لڑنی پڑی، یہ لڑائی صفین کہلاتی ہے۔ حضرت امیر معاویہ شام کے علاقہ کے گورنر تھے، انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انکار کر دیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے بدلہ کا مطالبہ کرنے کے لیے نکلے۔ صفین کے مقام پر دونوں کی

فوجوں میں کتنے ہی دن لڑائی ہوتی رہی، جس روز حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے آخری زبردست حملہ کیا ہے اور شامی فوجوں کو شکست ہو جانے کے آثار ظاہر ہو گئے تھے، شامی فوجوں نے صلح کے لیے نیزوں پر قرآن بلند کیے اور کہا ہمارے تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے اس کے مطابق فیصلہ ہو۔ سیدنا علی چاہتے تھے کہ لڑائی جاری رکھیں اور مکمل فتح حاصل کریں مگر خود ان کی فوج نے ساتھ چھوڑ دیا اور انھیں مجبور کیا کہ لڑائی بند کر دی جائے۔

صلح کے لیے ثالث مقرر کیے گئے، حضرت امیر معاویہ کی جانب سے حضرت عمرو بن العاص مقرر ہوئے اور حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنی طرف سے حضرت ابو موسیٰ کو ثالث بنائیں، حالانکہ سیاست کے میدان میں وہ کسی صورت سے حضرت عمرو بن العاص کے مقابل نہ تھے۔

مقررہ وقت پر ثالثوں نے ملاقات کی، حضرت عمرو بن العاص نے حضرت ابوموسیٰ کو راضی کر لیا کہ وہ پہلے اعلان کریں کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلافت سے ہٹاتے ہیں اور بعد میں مسلمان کسی کو اپنا امیر منتخب کر لیں۔ جب انھوں نے یہ اعلان کر دیا تو حضرت عمرو بن العاص نے اعلان کیا کہ ''جس بات پر ہم متفق ہو گئے تھے وہ انھوں نے بتادی میں بھی سیدنا علی کو معزول کرتا ہوں، ان کی معزولی کے بعد جھگڑا ختم ہو گیا اور اب حضرت امیر معاویہ کا کوئی مقابل نہ رہا، اس لیے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار ہونے کی حیثیت سے وہی ان کے جانشین باقی رہتے ہیں''۔

ثالثی کی اس کارروائی کے نتیجہ میں خلافت کی شوکت کو بہت نقصان پہنچا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جو برحق خلیفۂ راشد تھے پورے اسلامی علاقہ پر ان کا اقتدار باقی نہیں رہا، مصر و شام تو نکل ہی گئے تھے جو علاقے ان کے زیرنگیں تھے ان میں بھی کسی قسم کا حکومتی انتظام قائم نہیں رہا، کیونکہ خود وہ جماعت جس نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا یا تو بے عمل ہو گئی یا مقابلہ پر کمربستہ، ایک گروہ نے علیحدگی اختیار کر لی تھی، وہ نہ صرف یہ کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نہیں مانتا تھا بلکہ یہاں تک ان کے خلاف تھا کہ وہ انھیں مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا، یہ لوگ تاریخ میں خارجی کے نام سے مشہور ہوئے ہیں۔

دوسرا گروہ جو بظاہر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا اور شیعان علی کہلاتا تھا، اس کا حال یہ تھا کہ اس کے جذبات مردہ ہو چکے تھے، نہ اپنے بادشاہ سے دلچسپی تھی نہ حکومت سے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ انھیں کیسا کیسا سمجھاتے تھے، غیرت دلاتے تھے مگر ان کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی اور وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جن سے اسلامی حکومت کو فائدہ پہنچنا چاہیے تھا اتنا دل شکستہ ہو گئے تھے کہ ہر وقت اپنی موت کا انتظار کیا کرتے تھے، اکثر انھیں یہ کہتے ہوئے سنا جاتا تھا کہ اے شقی تو کہاں ہے بہت دیر لگا دی۔

خلافت راشدہ کے اس آخری زمانہ میں اسلامی فتوحات بالکل ہی رک گئیں اور آپس کی لڑائیوں سے بہت بڑی طاقت ضائع ہوئی اور ایسے اختلافات ابھر کر سامنے آ گئے جنھیں اسلام نے مٹا ڈالا تھا۔

خارجیوں کی ایک جماعت نے مشورہ کے بعد یہ طے کیا کہ تین شخصیتیں اصل فساد کی جڑ ہیں اگر انھیں قتل کر دیا جائے تو پھر حالات قابو میں آ سکتے ہیں اور باہم عہد کیا کہ ہم میں سے ہر ایک ایک آدمی کو قتل کر دے گا اور امت کو فتنوں سے بچائے گا۔ حملہ کا دن تاریخ وقت مقرر کیا گیا چنانچہ شام میں حضرت امیر معاویہ پر فجر کی نماز کے وقت حملہ ہوا مگر وار اوچھا پڑا، آپ کے پچھلے حصہ پر معمولی سا زخم آیا۔ مصر میں حضرت عمرو بن العاص پر بھی فجر کے وقت حملہ ہوا مگر اتفاق سے اس روز وہ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے فجر کی نماز پڑھانے مکان سے نکلے ہی نہ تھے، دوسرے کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیا تھا، اس لیے دھوکے سے حملہ اس پر ہوا، حضرت عمرو بن العاص بالکل محفوظ رہے۔ عراق میں سیدنا علی پر بھی اسی روز فجر کی نماز میں حملہ ہوا، حملہ آور کامیاب ہوا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ مہلک طور پر زخمی ہو گئے اور اسی سے وفات پائی۔

سیدنا حسن اور اتحاد امت:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے ماننے والوں نے ان کے صاحبزادہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور انھیں اسی فتنہ کی طرف بلایا جس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پھنسا کر ان کا ساتھ نہ دیا تھا۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے بیعت کرنے والوں سے اقرار لیا کہ صلح ہو یا جنگ تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا۔ اس طرح محسوس کیا جانے لگا کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعہ

سے فتنہ کو ہوا ملنا مشکل ہو جائے گا۔

سیدنا حسن نے اپنی فوجیں شام کی طرف بڑھائیں، ادھر سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عراق کی طرف پیش قدمی کی، حضرت امیر معاویہ نے ایک سادہ کاغذ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا کہ صلح کے جو شرائط بھی آپ مناسب سمجھیں لکھ لیں وہ منظور کر لیں گے۔ عین میدانِ جنگ میں مقابل سردار پر ایسا اعتماد کسی نے نہ کیا ہوگا جس کی مثال حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے پیش کی اور فوجی طاقت رکھتے ہوئے بادشاہت سے دست بردار بھی اتنی آسانی سے کوئی نہ ہوا ہوگا جیسا کہ سیدنا حسن نے کیا۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے حضرت امیر معاویہ کو بادشاہ تسلیم کر لینے پر خلافت راشدہ ختم ہو گئی۔ یہاں سے بادشاہت کا دور شروع ہوتا ہے جو اگر چہ پوری طرح اسلامی نہیں کہی جا سکتی مگر اس میں عربی اور اسلامی روایتوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اب جو بادشاہت شروع ہوئی وہ بنوامیہ کی حکومت کہلاتی ہے، شروع سے آخر تک خالص عرب حکومت رہی، کبھی کبھی اس میں اسلامی حکومت کی شان بھی نظر آ گئی مگر بہت ہی کم۔

حضرت امیر معاویہ نے خلیفہ ہو جانے کے بعد نظامِ حکومت میں جو سب سے بڑی تبدیلی کی وہ یہ کہ حکومت کو جمہوری کی بجائے شخصی حکومت میں تبدیل کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کے بعد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک جتنے بھی خلیفہ ہوئے ان کا انتخاب رشتہ کی بنیاد پر نہیں ہوتا تھا، مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کی رائے سے جو شخص بھی موزوں ہوتا تھا اس کی اطاعت کا سب عہد کر لیتے تھے صرف حضرت علی کے بعد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے انتخاب کو باپ کے بعد بیٹے کا انتخاب کہا جا سکتا ہے مگر وہ بھی حضرت علی کی نامزدگی کی بنا پر نہیں ہوا تھا اور پھر ہنگامی حالات میں اگر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو چن لیا گیا تو اس وقت حکومت شخصی نہیں ہوئی تھی۔

ولایت عہد:

حضرت امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے جانشین کے مسئلہ کو طے کر دینا ضروری سمجھا۔ اگر وہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرح انتخاب میں صلاحیت کو ہی پیش نظر رکھتے تو یہ بات کسی کو

بھی ناپسند نہ ہوتی، مگر انھوں نے اپنے لڑکے کا انتخاب کیا جس پر بعض لوگوں کو اعتراض ہوا اور انھوں نے پیشگی بیعت سے انکار کر دیا۔ ان میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شخصیتیں بہت نمایاں ہیں، اس کے باوجود چونکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سب سے بہت ہی فیاضانہ سلوک کرتے تھے اس لیے ان کی بات کو اکثر لوگوں نے مان لیا اور انھوں نے اپنی زندگی میں ہی یزید بن معاویہ کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا۔

یزید کی پرورش عرب کے روایتی طرز پر بدؤں میں ہوئی تھی۔ اس لیے اس میں عرب جاہلیت کی تمام خصوصیات نمایاں تھیں لیکن اسلامی خلافت کے لیے ضروری ہے کہ خلیفہ کو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہونا چاہیے، اس لیے یہ انتخاب ملکی انتظامات کے لیے اچھا ہو تو ہو مگر اسلامی روایات کے مطابق نہ تھا۔

حادثات کربلا:

یزید کا دورِ حکومت ایک عرب بہادر فیاض اور شاعر کا دورِ حکومت ہے۔ تمام سلطنت میں عہدہ دار نہایت مستعدی سے انتظامات کرتے نظر آتے ہیں مگر اس دور میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھر گیا اگر چہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں مکمل طور پر وہ ذمہ دار نہ تھا، اس نے تو صرف بیعت لینے کے احکام دیئے تھے مگر انکار و اصرار میں جو کشمکش بڑھی اسی کے سلسلے میں یہ ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کو خلیفہ تسلیم کرنے پر رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حکومت کی طرف سے مدینہ کے والی نے بیعت پر اصرار کیا اور ادھر سے انکار رہا، یہ خبر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پہنچی کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا ہے اور بیعت سے انکار ہے تو ان لوگوں کو جو خود کو شیعانِ علی کہتے تھے پھر حوصلہ ہوا کہ وہ پھر ایک بار امت کو اسی کشمکش سے دوچار کر دیں جس سے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے چھڑایا تھا۔

مدینہ سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ مکہ چلے گئے مگر کوفہ سے لوگوں کے اصرار کے خطوط برابر آتے رہے کہ آپ یہاں آ جائیں تو ہزاروں جاں نثار آپ کا ساتھ دیں گے اور یزید کی حکومت کا تختہ الٹ

دیں گے۔ تمام اہل الرائے اصحاب نے جن میں حضرت ابن عباس بھی شامل تھے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کی بدعہدی کی یاد دلائی جو وہ ان کے والد کے ساتھ کر چکے تھے اور بہت سمجھایا کہ وہ اُدھر کا قصد نہ کریں مگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے مشورہ قبول نہ کیا اور ان لوگوں کی دعوت پر بھروسہ کر کے عازم کوفہ ہوئے۔

راستہ میں ہی ان لوگوں کی بدعہدی اور بے وفائی کا ثبوت اس خبر سے مل گیا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قاصد خصوصی حضرت مسلم کوفہ میں شہید کر دیئے گئے اور کوئی بھی ان کی مدد کے لیے نہیں آیا مگر اب یہ دشواری تھی کہ وہ قدم بڑھا چکے تھے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ان کی شخصیت کے مقابلہ میں یزید کسی طرح بھی مستحق خلافت نہیں ہوسکتا تھا، وہ خود کو حق پر سمجھنے میں یقیناً حق بجانب تھے اس لیے واپس جانا انھوں نے سچائی کے خلاف سمجھا اور وہ کوفے کی فوجوں میں گھر گئے جن میں بیشتر وہ افراد موجود تھے جنھوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت کا وعدہ کرتے ہوئے دعوتی خطوط لکھے تھے۔

یہ اصرار برابر قائم رہا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ یزید کی خلافت کو تسلیم کرلیں اور بیعت کرلیں، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے صلح کی بہت کوشش کی اور بہت سی صورتیں پیش کیں مگر ان لوگوں نے اور کسی بات پر راضی ہونے سے انکار کر دیا۔ بالآخر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے تھوڑے سے ساتھیوں کو لڑ کر جان دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہ رہ گیا اور جس بات کو حق سمجھتے تھے اس پر قائم رہے اور نہایت صبر وہمت سے جان دی مگر حق پر آنچ نہ آنے دی۔

حادثہ کربلا اتنا عظیم تھا کہ اس دھبے کو اموی دور کے تمام کارنامے بھی نہ دھو سکے اور یزید کا نام ہمیشہ برائی سے ہی لیا گیا حالانکہ شہادت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی پوری ذمہ داری اس پر آتی بھی نہیں، اس نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اگر کوفہ کی فوجیں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی اس پیشکش کو مان لیتیں کہ ''بیعت لینے یا لڑنے کی بجائے تم ہمیں یزید کے پاس لے چلو اس سے مل کر ہم تصفیہ کرلیں گے'' تو ممکن تھا یہ ناگوار حادثہ رونما نہ ہوتا۔

معاویہ بن یزید:

یزید کے بعد معاویہ بن یزید کو وراثت میں حکومت ملی مگر انھوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر

لی اور کہہ دیا کہ مسلمان کسی اہل کا انتخاب کر لیں میں حکومت نہیں چاہتا اور کچھ دنوں میں ہی ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ ان کے اس طرح حکومت سے بے تعلقی اور پھر انتقال نے صورت حال ایسی پیدا کر دی تھی کہ اگر اطمینان کے ساتھ عام رائے معلوم کی جاتی اور کسی اہل شخصیت کا انتخاب ہو جاتا تو امت کے لیے بہت ہی بہتر ہوتا۔

مروان و آل مروان:

بنو امیہ میں مروان بہت ہی شریر النفس تھا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی حقیقت میں اسی کی غلط کاریوں کی وجہ سے ہوئی، مروان نے محسوس کیا کہ اگر عام انتخاب کا انتظار کیا جائے گا تو یہ بات بالکل یقینی ہے کہ حکومت بنو امیہ کے خاندان کو ہرگز نہ ملے گی اس لیے اس نے فوراً خود کو اس کے لیے پیش کر دیا اور اس سے پہلے کہ دوسرے سامنے آئیں وہ تخت پر بیٹھ گیا اور اپنی بادشاہت کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے یزید کی بیوہ خالد کی ماں سے نکاح بھی کر لیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں لوگ خالد کو تخت پر نہ بٹھا دیں، جو بہت بڑا عالم اور عوام میں مقبول تھا۔

مروان کی موقع شناسی نے تقریباً سو سال کے لیے اس کے خاندان میں بادشاہت کو محفوظ کر دیا۔ اموی دور میں بادشاہت وراثت میں ملنے لگی، بیٹے، بھائی، بھتیجے پہلے سے ولی عہد بنا دیئے جاتے اور بادشاہ کے بعد تخت پر بیٹھ جاتے۔ اموی بادشاہوں میں اسلامی خلافت کی شان صرف تھوڑے دن کے لیے نظر آتی ہے جبکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز تخت پر بیٹھے، اگر ان کی عمر وفا کرتی تو ممکن تھا کہ پھر ایک بار بادشاہت کی بجائے خلافت کی حکومت ہو اور مسلمانوں کو پھر وہی اسلامی جذبہ مل جائے جو خلافت راشدہ کے بعد معدوم ہو گیا۔

عہد اموی:

فتوحات اور ملکی انتظامات کے اعتبار سے اموی دورِ حکومت بہت تابناک ہے۔ مسلمان مشرق و مغرب پر چھا گئے اور بنو امیہ کے بعد کسی کو بھی اتنی بڑی سلطنت پر بادشاہت کرنا نصیب نہ ہوا۔

اموی دور کو خالص اسلامی دور تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بادشاہوں اور امرا میں وہ سادگی اور سچائی نہیں رہی جو مسلمان بادشاہوں اور امرا میں ہونا چاہیے۔ مگر بہر حال وہ عرب خصوصیات کا حامل ضرور

ہے،عربوں کی بہادری اور دوسری خصوصیات اموی دور میں پورے طور پر نظر آتی ہیں اس لیے اموی بادشاہت عربی بادشاہت ضرور کہلائی جاسکتی ہے۔

تمدنی اور علمی اعتبار سے بھی اموی دَور روشن دور ہے،فتوحات کے سلسلہ میں عربوں کو باہر والوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا جس کا اثر ان کے تمدن میں ظاہر ہوتا ہے۔وہ خانہ بدوشی جو عرب میں عام تھی کم ہوتی گئی اور شہری زندگی پروان چڑھی۔بادشاہوں اور امرا کے ایوان تعمیر ہوئے اور درباروں کی شان وشوکت نظر آنے لگی۔

علمی اعتبار سے بھی اموی دور بہت اہم ہے کیونکہ باوجودے کہ اس دور میں فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اندرونی خلفشار سے بھی حکومت کو آئے دن نبٹنا پڑا پھر بھی تمام علوم کی طرف توجہ کی گئی۔تفسیر،حدیث،ادب عربی کے علاوہ علوم عقلیہ (سائنس) کی طرف بھی عربوں نے توجہ کی۔خالد بن یزید نہ صرف حدیث اور ادب کا بڑا عالم گذرا ہے بلکہ وہ بہت بڑا کیمیا داں بھی تھا،اس کی ذاتی تجربہ گاہ تھی جہاں وہ تجربات کیا کرتا تھا اور اپنے شاگردوں کو پڑھاتا تھا۔

غرض کہ اموی دور انتظامات ملکی،فتوحات اور تمدنی وعلمی ترقیوں کے اعتبار سے عربوں کا بہت ہی زریں زمانہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔




Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM


Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM